راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 20 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

مدیرِ اعلیٰ : عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

مارچ 2019ء

افکار کے بہتے ہوئے دھارے کو جو بھی اظہار یہ ممکن ہو وہ اس میں ڈھل جاتا ہے

کچھ عرصہ سے محسوس ہو رہا ہے کہ ہر شعبہ میں غیر سنجیدگی کی فضا ہے

نامور شاعرہ، افسانہ نویس اور سفرنامہ نگار

نیلما ناہید درانی

سے مدیرِ اعلیٰ ارژنگ معروف شاعر، کالم نگار، سفرنامہ نگار

عامر بن علی

کا مکالمہ

سب سے پہلے ادبی و سوانحی پس منظر سے آگاہی دیجئے

عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟

ادب سے شوق کی ابتدا؟

میں لاہور میں پیدا ہوئی۔ امی کا خاندان لاہور میں برانڈرتھ روڈ پر رہتا تھا۔ امی کے دادا حکیم محمد ذکریا انجمن حمایت اسلام طبیہ کالج کے پرنسپل تھے۔ امی کے والدین ان کے بچپن میں وفات پا گئے تھے ان کی پرورش ان کے دادا اور دادا کے بعد ان کے چچا نے کی تھی۔ شادی بھی چچا نے کروائی۔ میرے والد کا خاندان امرتسر سے لاہور آیا تھا۔۔ پاکستان بننے کے بعد۔ میرے دادا مولانا آغا نعمت اللہ جان درانی۔ خطیب اہلبیت تھے ان کا تخلص احقر امرتسری تھا۔ ان کی کتابیں چھپ کر گھر میں آتی تھیں۔

"شانِ عزا" اور "یادِ حسینؑ" ان کی دو کتابوں کے نام ہیں۔ میرے والد آغا اعجاز حسین درانی کو شاعری، افسانہ نگاری اور مصوری سے لگاؤ تھا۔ امرتسر میں اے حمید اور سیف الدین سیف سے دوستی تھی۔ وہ گفتگو کے دوران اقبال، غالب کے اشعار پڑھا کرتے جو بچپن میں ہی ہمارے ذہنوں میں محفوظ ہو گئے تھے۔ گھر میں کتابوں کی فراوانی تھی۔ بہت سارے رسائل بھی آتے تھے۔ ہمیں ہر ماہ بچوں کی دنیا، تعلیم و تربیت، ہدایت لے کر دیے جاتے۔ ان دنوں گلی محلوں میں آنا لائبریری بھی ہوتی تھی۔ ہم وہاں سے لا کر بھی کتابیں پڑھتے۔ یوں والد اور دادا نے ہمیں مطالعہ کرنے کے ساتھ لکھنے کی ترغیب بھی دی۔ پہلی کہانی ماہنامہ ہدایت میں چھپی جب میں چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی۔ رسالہ کے ایڈیٹر جناب نظر زیدی تھے۔ پہلی نظم 1965 کی جنگ کے بارے میں لکھی۔

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیراہتمام مسلسل اشاعت کا 19 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 20 مارچ 2019 شمارہ نمبر 3

مدیر اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیر ◉ حسن عباسی

{مجلس ادارت}

◉ ڈاکٹر صغرا صدف ◉ ابرار ندیم ◉ لبنیٰ صفدر

{مجلس مشاورت}

◉ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک ◉ ظفر خان (آسٹریلیا) ◉ ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ ● زرتاب کمپوزنگ : 0321-4730769 فوٹو گرافر ● نعمان حسن: 0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس ● محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 نازاوکاڑوی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے مندرجہ ذیل نام اور شناختی پر مبلغ -/1000 روپے بذریعہ ایزی پیسہ، موبی کیش، یوپیسہ یا یو بی ایل اومنی سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ پہلی کاپی اعزازی بھیجی جائے گی۔

حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31204-7298386-9

فہرست

حمد ونعت / 2 ،

مضامین:

○ ڈاکٹر سلیم اختر - یادوں کے آئینے میں/ ڈاکٹر سیّد قاسم جلال ، 3

○ عباس خان ایک نابغۂ روزگار / ڈاکٹر کوثر محمود ، 4

○ نیاز احمد - ایک منفرد موسیقار، ایک منفرد دوست/ بختیار احمد ، 10

○ ایک روشن دماغ تھا...... نہ رہا / اقبال راہی ، 13

○ حضرت ابرار ندیم اوران کی "اساں دل نوں مرشد جان لیا" پر ایک نظر / اطہر جعفری ، 14

○ "نظم کا سچا شاعر" شہزاد نیّر / محمد شفیق ، 16

○ "نور کا جلوہ" اور اعظم سہیل ہارون / ریاض ندیم نیازی ، 18

رپورٹیں

○ تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے / حسن عباسی ، 20

○ ناز بٹ کے شعری مجموعے "وارفتگی" کی تقریب رونمائی ، 22

افسانے

○ پھر ہمیں قتل ہو آئیں یار / ڈاکٹر عطیہ سیّد ، 24

شاعری/ 30 تا 32

سفرنامہ

○ امریکی سرحد کے اُس پار / عامر بن علی ، 33

○ کوالالمپور کا سفر / سعدیہ بتول ، 35

○ بزرگانِ دین کے شہر ملتان سے قلعہ دراور تک/ ایم-آر-شاہد، 38

○ انٹرویو: نیّر ناہید درانی ، 41

○ انٹرویو: محمد سلیم ساگر ، 43

○ انٹرویو: امجد جاوید ، 45

شعری گوشے:

○ فہیم شناس کاظمی، وحید بسمل، طاہر عدیل، ہمایوں پرویز شاہد، 48 تا 51

مختصر ادبی خبریں ، 52

تبصرہ کتب ، 54

نامہ ہائے احباب ، 56

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد و نعت

دے جبینوں کو سجدے، کرم اے خدا
نور سے بھر دے سینے، کرم اے خدا
نوعِ انساں خسارے میں ہے، شک نہیں
دور کر دے خسارے، کرم اے خدا
خوف کے گنبدوں میں مقید ہیں ہم
کھول دے ہم پہ رستے، کرم اے خدا
جس قدر سنگ ریزے ہیں دامان میں
کر دے اُن کو ستارے، کرم اے خدا
دے رہے تھے تمازت جو اُمید کو
بجھ گئے وہ شرارے، کرم اے خدا
بھیج بارانِ رحمت کہ تخلیق کے
ہو گئے خشک چشمے، کرم اے خدا
چھا گئے ہیں اندھیرے جو اطراف میں
کر دے اُن کو اُجالے، کرم اے خدا
ہم تمازت غضب کی نہ سہہ پائیں گے
رکھ ہمیں سائے سائے، کرم اے خدا
جو ہے جعفر حسن نامرادِ ازل
رکھ اُسے اپنے دوارے، کرم اے خدا

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک/فیصل آباد

نظر جب سے مدینہ آ گیا ہے
عبادت کا قرینہ آ گیا ہے
اُچھالے پھر رہی تھیں جس کو موجیں
وہ ساحل پر سفینہ آ گیا ہے
میری آنکھیں چھلکتی جا رہی ہیں
بن مو کو پسینہ آ گیا ہے
جہاں بھرتی ہیں خالی جھولیاں بھی
شفاعت کا وہ زینہ آ گیا ہے
میں سجدہ ریز ہوں غارِ حرا میں
میرے دل میں خزینہ آ گیا ہے
وہ جس میں آپ کی آمد تھی آقاؐ
وہ بابرکت مہینہ آ گیا ہے

تسنیم کوثر/لاہور

میں گر رہا تھا ان کے کرم سے سنبھل گیا
نسبت سے ان کی میرا مقدر بدل گیا
گھیرا مصیبتوں نے تو خدمت میں آپؐ کی
آنکھوں کو بند کر کے میں پلکوں کے بل گیا
تختِ سکندری کو وہ دیکھے گا کس لیے
جو خوش نصیب آپ کے ٹکڑوں پہ پل گیا
یادِ رسولؐ پاک نے ایسا کرم کیا
بن کے غموں کا آیا تھا طوفان ٹل گیا
نوکِ سناں پہ دیکھا نواسہ رسولؐ کا
روئے فرشتے حوروں کا دل بھی دہل گیا
ساجدؔ کے لب پہ آ گیا صل علیٰ تو پھر
دل میں چھپا تھا غم کا وہ کانٹا نکل گیا

محمد امین ساجد سعیدی/حاصل پور

گر چاہیے ہے تجھ کو شفاعت رسولؐ کی
پھر صدقِ دل سے کر تو اطاعت رسولؐ کی
بعد از خدا تو مرتبہ بس آپؐ ہی کا ہے
کیسے بیان مجھ سے ہو عظمت رسولؐ کی
ہیں شاہِ دو جہاں کی غذا سوکھی روٹیاں
یہ سادگی رہی ہے معیشت رسولؐ کی
محفوظ کر لیں سینوں میں اپنے بھی ہم اسے
رب کا کلام تو ہے امانت رسولؐ کی
جتنا بھی اس پہ فخر کروں کم ہے دوستو
شامل ہے میرے نام میں نسبت رسولؐ کی
مولا کریم اپنا کرم کر تو رات دن
مشکل میں رات دن ہے یہ اُمت رسولؐ کی
خوش بخت خوش نصیب صحابہؓ ہیں کس قدر
دیکھی انہوں نے آنکھوں سے صورت رسولؐ کی
اُس کے لیے ہیں دونوں جہاں کتنے خوش نما
مل جائے آسی جس کو محبت رسولؐ کی

عدیل آسی/ڈنمارک

زندگی کی کشتیوں کے ناخدا تو آپؐ ہیں
ہم مسافر ظلمتوں کے، رہنما تو آپؐ ہیں
آپؐ کے ہی نور سے ہے روشنی اطراف میں
چاند تاروں اور سورج میں ضیا تو آپؐ ہیں
آپؐ ہی کا نور دیکھوں جس طرف بھی دیکھوں میں
شش جہت میں ہر طرف جلوہ نما تو آپؐ ہیں
دو جہاں کی ابتدا بھی آپؐ سے قائم ہوئی
دو جہاں کی شاہِ بطحا، انتہا تو آپؐ ہیں
اور کوئی در ٹھکانہ ہے نہ کوئی آسرا
ہم خطا کاروں کے اب تک ہم نوا تو آپؐ ہیں
آپؐ کا اسم مبارک ہے سکونِ قلب و جاں
جو بھی دل بیمار ہے اُس کی شفا تو آپؐ ہیں
آپؐ کا دربار ہے اُمید خبیرؔ کے لیے
اور کوئی بھی نہیں بے حوصلہ تو آپؐ ہیں

زاہد خبیر/سپین

ڈاکٹر سلیم اختر - یادوں کے آئینے میں

ڈاکٹر سیّد قاسم جلال

میں نے جب لکھنے کا آغاز کیا تو معروف نقاد، اُستاد اور افسانہ نگار ڈاکٹر سلیم اختر کی نگارشات کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ میں جب مطالعے کے لیے سنٹرل لائبریری بہاول پور جاتا تو وہاں جب مصنّفین کے ناموں میں ڈاکٹر سلیم اختر کی کثیر کتب کے نام دیکھتا تو حیران اور متاثر ہوتا۔ ان کی کتاب ''اُردو کی مختصر ترین تاریخ'' ان کی مقبول ترین کتاب ہے جو آج تک اُردو ادب کے ہر طالب علم کی ضرورت ہے۔

میں نے ان کی کئی کتب کا بطورِ خاص مطالعہ کیا ہے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن معروف محقق، نقاد اور ماہر تعلیم تھے۔ وہ ماہنامہ ''شام و سحر'' لاہور کے مدیر تھے۔ وہ مجھے یہ رسالہ ہر ماہ بھیجا کرتے تھے۔ اس رسالے میں میری نگارشات بھی شائع ہوتی رہتی تھیں۔ ہر سال کے آخری مہینے میں، اس میں ڈاکٹر سلیم اختر کا ''شام و سحر'' میں سال بھر شائع ہونے والی نگارشات کا جائزہ بھی شامل ہوا کرتا تھا۔ وہ اس جائزے میں میری تحاریر اور کتب کا بطورِ خاص ذکر کیا کرتے تھے۔ میں اپنی شائع ہونے والی ہر کتاب انھیں لاہور بھیجا کرتا تھا۔ وہ اکثر معروف اہل قلم کی روایت سے ہٹ کر مجھے خط کا جواب بھی دیتے اور میری کتابوں کے بارے میں اپنے مختلف تبصرے سے بھی نوازتے۔ حقیقت میں یہ ان کی اعلیٰ ظرفی اور بڑا پن تھا۔ ان کی یہ ادب نوازی سب کے لیے یکساں تھی۔

ان کے چہیتے اور محبوب شاگرد ڈاکٹر طاہر تونسوی تھے جنھوں نے ان سے ملتان کے کسی کالج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ طاہر تونسوی صاحب نے اپنے عظیم اُستاد کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ طاہر صاحب مجھ سے اکثر ڈاکٹر سلیم اختر کا شاندار الفاظ میں ذکر کیا کرتے تھے۔

میں نے اپنے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے میں ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب ''تنقید کا نفسیاتی دبستان'' کا بطورِ خاص حوالہ دیا ہے۔

میں جب ۲۰۱۵ء کو بہاولپور سے لاہور شفٹ ہوا اور وہاں علامہ اقبال ٹاؤن کی اتحاد کالونی میں سکونت اختیار کی تو مجھے معلوم ہوا کہ نزدیکی ''ستلج بلاک'' میں کچھ اہم ادبی شخصیات رہتی ہیں۔ وہاں میری ''سیاہ'' والے حفیظ الرحمٰن احسن، ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر سلیم اختر سے مسلسل ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

ڈاکٹر موصوف سے اُن کے گھر میں جب پہلی ملاقات ہوئی تو وہ گھر والوں کا سہارا لے کر ڈرائنگ روم میں آئے تو میں نے ان سے کہا کہ میری پچھلی کتابوں پر تو آپ مجھے ڈاک کے ذریعے تبصرے بھیجتے رہے ہیں۔ آج میں اپنا فارسی شعری مجموعہ ''پیامِ انقلاب'' آپ کو بدست خود پیش کرنے آیا ہوں۔ وہ میری بات سن کر بہت خوش ہوئے اور کتاب کے چند اوراق دیکھ کر کہنے لگے کہ ''جلال بھائی! میں اگرچہ بیماری کی وجہ سے کمزور ہو چکا ہوں لیکن میں حسب روایت اس کتاب پر اپنی رائے آپ کو لکھ کر ضرور دوں گا۔'' انھوں نے افرادِ خانہ میں سے کسی کو بلا کر اپنا قلم اور لیٹر پیڈ منگوایا اور اسے کہا کہ لکھو۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ انھوں میری کتاب کے بارے میں پندرہ بیس سطریں لکھوائیں اور مجھے دے دیں۔ اس مجبوری اور نقاہت کے عالم میں جب انسان اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہتا، میں نے اس مردِ درویش کی ادب سے سچی کمٹ منٹ کا حیران کن منظر دیکھا۔

بعد میں ان سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ فالج نے انھیں چلنے پھرنے سے معذور کر دیا تھا اور وہ اپنے کمرے تک محدود ہو گئے تھے۔ وہیں اُن سے تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ وہ کبھی لیٹ جاتے اور کبھی کرسی پر بیٹھ جاتے۔ وہ آخری دم تک بلند حوصلہ و پرعزم رہے۔ البتہ انھیں اس بات کا افسوس تھا کہ جو احباب اُن سے سے مسلسل رابطے میں رہتے تھے۔ آخری ایام میں انھوں نے اُن سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ صرف ڈاکٹر سلیم اختر کا ہی المیہ نھیں بلکہ تمام اہل و ادب کی غم ناک کہانی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ:

عروسِ وقت کے ماتھے کا ہیں وہیں جھومر
جو خونِ دل سے جلائیں سخن وری کے چراغ

علم و دانش کے فروغ کے لیے روشن کیے ہوئے ان کے چراغ ہمیشہ روشن رہیں گے۔ ڈاکٹر سلیم اختر حیاتِ فانی کا لبادہ اُتار کر راہیٔ ملک بقا ہو چکے ہیں۔ اُن کی لازوال ادبی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

جہاں علم و فن کا مان تھے سلیم اختر
ہمارے عہد کی پہچان تھے سلیم اختر

عباس خان ایک نابغۂ روزگار

ڈاکٹر کوثر محمود

پیرومرشد انعام اللہ خان صاحب کی اپنی ذات اتنی دلچسپ اور ہمہ جہت ہے کہ اُن پر ایک مستقل کتاب تصنیف کی جاسکتی ہے؛ بارہا ایسا ہوا کہ اُن کی سحر انگیز گفتگو جاری ہے اور سامعین دم بخود ہو کر محویت سے اُن کو سُن رہے ہیں اور سامعین بھی کوئی عامۃ الناس نہیں بلکہ اعلیٰ درجے کے ادیب شاعر اور فلسفے کے جید اساتذہ جو کہ خود بھی مسندِ ارشاد پر فائز ہیں۔

ایک دن ایسی ہی ایک محفل میں انعام اللہ خان صاحب نے ذکر کیا کہ ایک درویش ادیب، متعدد کتب کا مصنف، عباس خان، اعلیٰ عدلیہ سے ریٹائر ہو کر بھکر کے ایک دور افتادہ گاؤں میں صاحبِ فراش ہے۔ ناچیز کو تو اپنی کم علمی مار گئی کہ کیونکہ یہ نام ہی پہلی مرتبہ سنا تھا؛ خان صاحب نے مزید کہا کہ وہ فلسفے پر کئی کتب کے مصنف ہیں تو فلسفے کی پروفیسر محترمہ صدف منیر سے رہا نہ گیا اور گویا ہوئیں کیا اُن سے رابطہ ممکن ہے؟ تو خان صاحب نے بتایا کہ وہ فالج کا شکار ہو کر کنجِ عزلت میں علم کی شمع جلائے ہوئے ہیں۔

پتہ نہیں وہ لمحہ شاید قبولیت کا تھا کہ سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم خود اُن کی زیارت کو چلیں گے تو خان صاحب نے فوراً پیشکش کی کہ سفر، قیام وطعام کے سارے لوازمات اُن نے ذمے ہوئے۔ لاہور سے بھکر آٹھ گھنٹے کی مسافت کاسن کر صرف چار لوگوں کا شوقِ سفر ماند نہیں پڑا؛ قریشی منظور صاحب، پروفیسر صدف، اُن کی ہمشیرہ محترمہ فرخ صاحبہ اور ناچیز ڈاکٹر کوثر محمود......

قریشی منظور صاحب تو ہم سے پہلے ہی بھکر پہنچ گئے؛ دونوں خواتین اپنی کسی ناگزیر گھریلو مصروفیات کی بنا پر اس رفاقت سے کنارہ کش ہو گئیں، لیکن دسمبر کی ایک چمکیلی صبح کو ناچیز نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور خان صاحب کی گفتگو سے رس کشید کرتے ہوئے، جھنگ سے بھکر روڈ پر میانوالی ڈرائیور ہوٹل پر کھانا کھایا اور شام ڈھلے بھکر پہنچے؛ قریشی صاحب ہمارے منتظر تھے، جلدی جلدی انعام اللہ خان صاحب کے فلاحی مراکز، تعلیمی اداروں، ہسپتالوں پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور قریشی صاحب کی رہنمائی میں بھکر سے چند کلومیٹر دور دریائے سندھ کے کنارے عباس خان کے گاؤں "گجہ" پہنچے...... گفتگو، تبادلۂ خیالات کی نوبت ہی کب آئی، جو وقت تھا خاطر مدارات میں ہی صرف ہو گیا...... شام کے سائے گہرے ہوئے رہے تھے، انعام اللہ خان صاحب نے واپسی کا اعلان کیا تو ناچیز کی کیفیت صائبؔ تبریزی کے اس شعر کے مصداق تھی:

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

بوجھل دل کے ساتھ گجہ سے رخصت ہوئے لیکن سرخوشی کا پہلو یہ تھا کہ عباس خان صاحب نے اپنی تصنیف کردہ ڈھیر ساری کتب تحفتاً عنایت کیں؛ بھکر میں خان صاحب کی حویلی میں اصحابِ فہم ودانش سے ملاقات، پرتکلف کھانا، تادیر گپ شپ کے باوجود ایک کتاب تو اُسی رات پڑھ لی، باقی کتب؛ وقتاً فوقتاً زیرِ مطالعہ رہیں سوا اپنے تاثرات ساتھ ساتھ قلمبند کرتا گیا......

معروف افسانہ نگار فرحت پروین کہتی ہیں کہ مصنف کا اصل تعارف اُس کی تحریریں ہوتی ہیں سو، عباس خان سے ملاقات کی یہ صورت ہے کہ ان کتب کا جستہ جستہ تعارف پیشِ خدمت کیا جائے۔

دن میں چراغ اور دیگر مختصر فلسفیانہ تحریریں

فرانسیسی مفکر فلسفی، شاعر اور ڈرامہ نگار والٹیئر Voltaire کا کہنا ہے کہ کئی کئی جلدوں پر مشتمل ضخیم کتابیں کبھی بھی فکری اور معاشرتی سطح پر کوئی انقلاب نہیں لا سکتیں، انقلاب آفریں تحریریں ہمیشہ سادہ، مختصر اور غیر ضروری تفاصیل سے عاری ہوتی ہیں۔ عباس خان کی یہ کتاب والٹیئر کے اس قول کی روشن مثال ہے اور بجا طور پر اس کتاب کو بچوں کے غیر روایتی نصاب کا حصہ بنایا جاسکتا ہے۔ بطورِ خاص بچوں کو یہ کتاب ضرور پڑھانی چاہیے، میرے بچوں، بہزاد سارنگ اور ایمن رویل نے اس کتاب کے مندرجات کو بڑی دلچسپی سے سنا اور چیئر مین ماؤزے تنگ کے لانگ مارچ کے بارے میں جامع اور concrete معلومات حاصل کیں۔ اس کتاب کا ایک صفحہ بعنوان "میراتھان" نقل کیا جاتا ہے تاکہ اندازہ ہو کہ عباس خان کا اندازِ تحریر، کتنا سہل، جامع اور پُراثر ہے:

"میراتھان یونان میں ایک میدان کا نام ہے۔ یہ میدان پانچ میل لمبا اور دو میل چوڑا ہے۔ اس کے ایک طرف سمندر ہے اور باقی تین پہلوؤں کو پہاڑوں نے گھیر رکھا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ سے 490 سال قبل ایرانیوں نے یونانیوں پر حملہ کیا۔ دونوں کا آمنا سامنا اسی میدان میں ہوا۔ یونانیوں نے ایرانیوں پر فتح حاصل کی۔ ایک یونانی جنگ میں زخمی ہونے کے باوجود میراتھان کے میدان سے ایتھنز شہر (کے رہنے والوں) کو فتح کی خوشخبری دینے کے لیے دوڑا۔ میراتھان ایتھنز سے 24 میل دور ہے۔ وہ راستے میں بغیر دم لیے شہر کے دروازے پر پہنچا۔ دروازے پر موجود لوگوں کو اُس نے کہا "جشن مناؤ ہمیں فتح ہوئی ہے۔" یہ الفاظ کہنے کے بعد وہ دم توڑ گیا۔

یونانیوں نے اولمپک کھیلوں میں اُس بہادر آدمی

کی یادگار کے طور پر اس دوڑ کو بھی شامل کرلیا گیا اِس کا وقت اُس وقت سے میراتھان دوڑ پڑا۔

1896ء میں اولمپک کھیل از سرِ نو شروع ہوئے تو 24 میل طویل اِس دوڑ کا انتظام ہوا۔ پہلی مرتبہ اس دوڑ میں ایک یونانی ہی اول آیا۔ وہ وہاں کا ایک کسان تھا۔ اُس نے یہ دوڑ دو گھنٹوں پچپن منٹ اور بیس سیکنڈوں میں پوری کی۔"

جیسے "فضائلِ اعمال" قسم کی (......) کتابیں حصولِ ثواب کی خاطر "شد و مد" سے پڑھی جاتی ہیں؛ عباس خان کی اِس کتاب کو نہ صرف فلسفے کے طلباء بلکہ عام عوام کی فکری بالیدگی کے لیے "فضائلِ فلسفہ" کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔

ستاروں کی بستیاں......ریزہ ریزہ کائنات...... پل پل

مذکورہ بالا تینوں کتابیں عباس خان کی مختصر تحریریں ہیں جن کو فلسفیانہ افکار، اقوالِ زرّیں، تأثرات، ، اور satire کی ذیل میں رکھا جا سکتا ہے۔ اِن کتب میں عباس خان نے اپنے مطمعِ نظر کو، مختصر ترین، جامع اور مؤثر الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ان میں سے بیشتر تحریروں کو اُلوہی کیفیات کا آئینہ دار کہا جاسکتا ہے۔ اِن تحریروں کے زیریں تموجات میں وحدت و کثرت کے مباحث جھلکتے نظر آتے ہیں؛ مثلاً ایک ہی پھول کو ایک شخص فنا کا استعارہ سمجھتا ہے، دوسرا اِس کو حسن و جمال کا مرقع سمجھتا ہے، تیسرے کے خیال میں پھول جمالیاتی حس کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے، ایک اور اِس سے گلقند بنانے کا سوچتا ہے: علیٰ ھٰذا القیاس؛ یہ سب کائنات فکری اور طبعی طور پر بھی ایک وحدت کا ہی پرتو ہے اور آج تو یہ امر مسلمہ ہے کہ یہ کُل کائنات اور اس میں موجود ہر جاندار و بے جان شے، 115 عناصر یا elements اُن کی آمیزشوں سے بنی ہے اور یہ عناصر بذاتِ خود ایٹموں کے ذیلی ذرات سے تشکیل پاتے ہیں اور آج کا کائنات کی تخلیق اور اِس کے فاصلوں کی تفہیم، روشنی کی محیر العقول تیز رفتاری (29 کروڑ، 97 لاکھ، 92 ہزار، 458 میٹر فی سیکنڈ) اور کوارک quark (0.43 10^{-18}metre x نصف قطر) کے حوالے سے کی جارہی ہے اور کوارک کو اِس کائنات کی تشکیل میں خشتِ اول کہا جارہا ہے: یہ نور کی رفتار اور اتنی مختصر جسامت انسانی احاطۂ ادارک میں آسانی سے نہیں آتی اسی لیے حقیقت حال کو بیان کرنے کے لیے مثالوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ کائنات کی تشکیل کے وقت جو روشنی کا جھماکہ ہوا تھا جس کے نتیجے میں یہ کائنات تشکیل پائی تھی اور روشنی نے اپنا یہ سفر 13 ارب 79 کروڑ برس پہلے شروع کیا تھا اور یاد رہے کہ روشنی ایک سال میں 58 کھرب، 69 ارب، 71 کروڑ، 36 لاکھ میل کا سفر طے کرتی ہے؛ اور اگر روشنی کی رفتار سے ہم سفر کریں تو سورج تک پہنچنے میں ہمیں 8.3 منٹ لگیں گے، ہماری زمین کے قریب ترین ستارے Proxima Centuri تک پہنچنے میں ہمیں چار سال اور تقریباً سوا دو ماہ لگیں گے، ہم اپنی کہکشاں milkyway سے باہر نکلنے میں ایک لاکھ سال صرف کریں گے ، اور اگلی کہکشاں اینڈ رومیڈا Andromeda تک پہنچنے میں ڈھائی کروڑ سال لگیں گے؛ اِسی طرح چلتے چلتے 13 ارب، 79 کروڑ سالوں بعد ہمیں کائنات کے اُس کنارے پر پہنچیں گے اور کائنات کے اُس سرے پر جو واقعہ آج پیش آئے گا، یا اگر کوئی ستارہ یا کہکشاں آج وہاں تخلیق ہوتی ہے تو اُس کی خبر ہمیں زمین پر تیرہ ارب اُناسی کروڑ سال بعد ہوگی......

کائنات کے اتنے طویل فاصلے اور تخلیق کائنات کی اتنی لمبی مدت مدید آسانی سے سمجھ نہیں آتی سو یہ کائنات جو تیرہ ارب 79 کروڑ سال پہلے تخلیق ہوئی تو یہ کتنا لمبا عرصہ تھا؟ یقیناً ذہن چکرا جاتا ہے، فرض کریں کہ یہ کائنات محض دس ہزار سال قبل وجود میں آئی تو اسی تناسب سے دیگر کائناتی وارضی واقعات یوں ہوں گی کرۂ ارض کی تخلیق تقریباً سوا تین سال قبل ہوئی، کرۂ ارض پر ڈائنوسارز کی نسل در حقیقت ساڑھے چھ کروڑ سال قبل معدوم ہوئی تھی وہ محض 17 دن قبل کا واقعہ ہوگا، اسی پیمانے پر انسان نے 19 گھنٹے قبل دو ٹانگوں پر چلنا سیکھا، یسوع مسیح کی پیدائش فقط 46 سیکنڈ قبل ہوئی اور 1492ء میں کولمبس کو امریکہ دریافت کیے محض 5 سیکنڈ گذرے ہوں گے......

اتنا عرصہ کون زندہ رہا یا آئندہ رہے گا؟ یہیں شاعر اور فلسفی خالقِ کائنات سے اُلجھتے بھی، اُس سے سوال بھی کرتے ہیں، اپنا مطمعِ نظر بھی بیان کرتے ہیں ، کائنات کو ایسا اور ایسا ہونا چاہیے، اور پھر اپنی عاجزی اور نارسائی کا بھی برملا اعلان کرتے ہیں:

بہ دیارِ عشقِ تو ماندہ ام، ز کسی نہ دیدہ عنایتی
بہ غریبی ام نظری فگن کہ تو پادشاہِ ولایتی
عجزالعقول لدرکہ، نقص الحسوس لوصفہ
بکمالِ تو کہ برد رہی، نبود بجز تو نہایتی
(قراۃ العین طاہرہ)

تو کہ فلسِ ماہیِ حیرتی چہ زنی ز بحرِ وجود دم
بنشیں چو طوطی و دمبدم، بشنو خروشِ نہنگِ لا
(قراۃ العین طاہرہ)

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
(غالبؔ)

تو شب آفریدی ، چراغ آفریدم
سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
(اقبالؔ)

"صبح سے آپ شہر کے بازاروں میں پھر رہے ہیں لیکن آپ نے خریدا کچھ بھی نہیں، کیا وجہ ہے؟ میں نے کچھ نہیں خریدا! میں سقراط کی طرح

بازاروں میں یہ دیکھنے آیا ہوں کہ دنیا کی کتنی چیزیں ہیں کہ جن کی بفضلِ خدا مجھے ضرورت نہیں۔''

(عباس خان)

ایک انیک نظر دا دھوکہ ، ذرہ ذرہ بولے
آخری ونڈ ونڈارے کوثرؔ اِک تھئے ہیرے کولے

(ڈاکٹر کوثرؔ محمود)

انگریزی میں ایک اصطلاح سیلف اپریزل self appraisal کہلاتی ہے یعنی کوئی شخص اپنے آپ کو کس انداز میں اور کن الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ گو کہ عباس خان نے یہ الفاظ اپنی کسی اور تحریر میں استعمال کیے ہیں لیکن ناچیز کے نزدیک؛ عباس خان کے تعارف کے لیے یہ الفاظ کفایت کر جائیں گے:

''صبر، عاجزی، عبادات، تجربات، علم، مطالعہ اور تصانیف''

''الہام کی طرح سادہ، گہرا، محکم، بناوٹ سے ہٹ کر اور مقدس''

عباس خان نے کم سے کم الفاظ میں ایک جہانِ معنیٰ کو بیان کیا ہے کہ مجھے تو باقاعدہ حیرت ہوتی ہے کہ اُس نے شاعری کیوں نہ کی؟ عباس خان کا کہنا بجا ہے کہ تاریخ، فلسفہ اور ادب انسان کی پناہ گاہ ہیں اور شاید اِسی لیے عباس خان نے بھی خود کو تاریخ، فلسفے اور ادب کے حجروں میں معتکف کر رکھا ہے۔

عباس خان نے اپنی ایک تحریر بعنوان ''رفعت'' میں لکھا کہ:

''گھاس انسانی تہذیب کے ارتقاء کی ایک کڑی ہے۔ تخلیق بطن اور حاصل اِس کے عملی مظاہر ہیں۔ بیٹھنا وجدان، گیان اور نروان کی منزل ہے۔ گوتم بدھ کو اِسی حالت میں یہ پیغام ملا کہ دُکھ اور غم آرزوؤں سے برآمد ہوتے ہیں......''

میں اِس میں اتنا اضافہ کروں گا کہ بقول مولانا رومؔ گھاس تناسخ کا بھی ایک استعارہ ہے:

من چو سبزہ بار ہا روئیدہ ام
ہفت صد ہفتاد (770) قالب دیدہ ام

(مولانا جلال الدین رومیؔ)

سلطنتِ دل سے......رام لعل کے خطوط عباس خان کے نام

تاریخ و ادب کا ادنیٰ طالب علم ہونے کی وجہ سے، میانوالی اور بھکر سے خصوصی تعلق کی بنا پر رام لعل کے خطوط بنام عباس خان کا یہ مجموعہ سب سے پہلے اور پہلی فرصت میں پڑھا اور پاکستان ریلوے کا ایک افتخار یہ بھی ہے کہ رام لعل جیسے مایہ ناز ادیب ریل کے محکمے کے ساتھ وابستہ رہے ہیں۔

''کتابوں کے صفحوں پر اور پڑھنے والوں کے دلوں میں زندہ رہنے والے معروف مصنف رام لعل، 1938ء میں ضلع میانوالی (بھکر تب ضلع میانوالی میں شامل تھا) میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے جو خطوط عباس خان کو لکھے اُن کی سطر سطر نہ صرف اپنی جنم بھومی میانوالی کے عشق کی آئینہ دار ہے بلکہ تاریخ، سماجیات اور اپنی دھرتی سے دور کر دیے جانے کا ایسا نوحہ ہے کہ جس کو پڑھتے ہوئے کلیجہ شق ہوتا ہے؛ کاش ہم بھی اپنی دھرتی سے ایسے ہی محبت کر سکتے! رام لعل اپنے ایک خط میں عباس خان کو لکھتے ہیں:

''آپ نے میری خودنوشت ''کوچۂ قاتل'' میں میانوالی کو کروٹیں لیتے ہوئے محسوس کیا ہے۔ میں آنکھیں بند کر کے آج بھی اُسی فضا میں پہنچ جاتا ہوں۔ میرے پاس سرائیکی زبان کے کچھ ٹیپ ہیں؛ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی، ایوب نیازی، پٹھانے خان، ریشماں، عالم لوہار، نور جہاں وغیرہ کے۔ اب کے ڈنمارک میں نصر ملک نے مجھے اعجاز حسین حضروی، حسین بخش (گلو)، مائی بھاگی وغیرہ کے ٹیپ بھی عنایت کر دیے ہیں۔ میں جب بھی گرد و پیش سے آزاد ہو کر سابق وطن پہنچ جانا چاہتا ہوں تو یہ ٹیپ لگا لیتا ہوں۔ عرصہ تیس سال پہلے میرا افسانہ ''نئی دھرتی پرانے گیت'' پڑھ کر میانوالی کے ایک معمر وکیل دیال چند بانگا، جو، اب آنجہانی ہو چکے ہیں، نے مجھے راستہ روک کر اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا......''اگر ہمیں زندہ رہنے دینا چاہتے ہو تو ایسے افسانے مت لکھا کرو۔'' آج میرے اپنے زندہ رہنے کے لیے یہی ٹیپ ایک بہانہ اور ذریعہ ہیں۔ میانوالی کی مٹی ہمارے اِس مکان کی بنیاد میں موجود ہے جو میں وہاں سے دس سال قبل لے کر آیا تھا۔ معاف کیجئے گا میں جذبات کی رو میں کہیں اور بہہ گیا۔''

ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ ہمارے ادیب شاعر معاشی طور پر کسمپرسی کا شکار کیوں رہتے ہیں؟ ہم اُن کی صلاحیتوں کا دل کھول کر اعتراف نہیں کرتے، رام لعل کے ایک خط سے ہی ضمناً یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ 1989ء میں اُن کے پاس کلر ٹی وی خریدنے کی استطاعت نہیں تھی لیکن اِس بے لوث ادیب کا ایثار دیکھئے کہ جب حکومتِ ہند کی طرف سے اُن کو دس ہزار روپیہ کا ادبی ایوارڈ ملا تو اُنہوں نے وہ رقم شوکت خانم ہسپتال، لاہور کو عطیہ کر دی...... یقیناً یہ لوگ ہر لحاظ سے بہت بڑے تھے اور ہمیں اُن کی قدر ناشناسی پر کم از کم شرمندہ تو ہونا چاہیے۔

سچ

عباس خان کی شدھ فلسفے، تاریخ اور سماجیات کے ایک خلاصے کے طور پر لکھی گئی کتاب ''سچ'' پر کوئی علمی محاکمہ پیش کرنا ناچیز کی علمی حیثیت سے بلند تر کام ہے اِس کتاب پر مناسب تبصرہ، فلسفے کی استاد، پروفیسر صدف منیر صاحبہ احسن طور پر کر سکتی ہیں اور شنید ہے کہ اُنہوں نے اِس کام کا آغاز کر دیا ہے سو اِس کتاب کے مکمل تعارف کے لیے اُن کی رائے کا انتظار کیا جائے۔

اِس کتاب میں آرنلڈ ٹوائن بی Arnold Toynbee کی، 61-1934ء کے دوران شائع ہونے والی بارہ جلدوں پر مشتمل، فلسفۂ تاریخ پر شہرۂ آفاق کتاب A study of history کے بارے میں، ''آوازِ دوست''، ''سفرِ نصیب'' اور ''لوحِ ایام'' جیسی لاجواب کتب کے مصنف مختار مسعود کے تأثرات پڑھ کر جہاں ایک عجب سرشاری کا احساس ہوا وہیں اپنی کم علمی اور فکری کم مائیگی کا احساس پختہ تر ہوتا گیا اور ناچیز کے ذہن میں یہ بات راسخ ہوتی گئی کہ تاریخ خدا کی جاریہ تخلیق کا ایک آئینہ ہے اور یہ بھی بجا طور پر کہا گیا ہے کہ تہذیبوں کو قتل نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ خودکشی کے ذریعے مرتی ہیں۔:

''ٹوائن بی کی دقتِ نظر کا یہ عالم ہے کہ اُس کے لیے زمان و مکان کی قیود بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں۔ اُس کے لیے ہزار ہا سال سمٹ اور سکڑ جاتے ہیں، اُس کا ذہن پھیلتا اور اُن پر حاوی ہو جاتا ہے۔ وہ ہزاروں سال کے فاصلے کو چشم زدن سمجھ کر طے کرتا ہے اور اتنے بُعد کے باوجود لوگوں اور واقعات میں ربط، معنی اور ہم آہنگی تلاش کرتا ہے۔ ازل سے ابد تک فاصلہ اتنا طویل ہے کہ چھ ہزار سال کی (تحریری) تاریخِ انسانی کو ٹوائن بی (محض) ایک لمحہ قرار دیتا ہے۔ اُس نے اقرار کیا ہے کہ چھ بار اُس کی زندگی میں ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی کتاب کو پڑھتے یا کسی تاریخی مقام کو دیکھتے ہوئے وقت یوں پیچھے لوٹ گیا کہ اُس کے سارے حواس نے یہ محسوس کیا کہ وہ خود اِس واقعہ کا چشم دید گواہ اور اِس ڈرامے کا اصل کردار ہے......''

''ٹوائن بی کے تجربات میں زمان و مکان کی قید سے آزادی کا ایک سمبل وہ تصویر بھی ہے کہ جو فرا اینگلیکو ☆(Fra Angeliko......فلورنس کا رہنے والا اطالوی مصور، متوفی: 18 فروری 1455ء) کی بنائی ہوئی ہے اور لندن کی نیشنل گیلری میں رکھی ہوئی ہے۔ اِس کا عنوان حسنِ نظر ہے اور اِس تصویر میں یسوع مسیح، فرشتے، پیغمبر، برگزیدہ ہستیاں اور بہت سے ایسے لوگ جو تاریخ کے مختلف ادوار اور دنیا کے مختلف علاقوں میں پیدا ہوئے تھے ......'روز لینڈ مرے' نے بیان کیا ہے کہ: 'میرا جذبہ خواہ غمِ بے کسی کا ہو خواہ جوشِ طرب کا کبھی تنہا نہیں ہے۔ لاتعداد رفیق میرے پاس کھڑے ہیں، میرے ساتھ ماتم یا مسرت میں شریک ہیں۔ یہ میرے گم نام و بے نشان دوست ہیں جو میری پیدائش سے ہزار ہا سال پہلے اِس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔''

''یہ 29 فروری 1960ء کی بات ہے...... یہ بات ملتان شہر کی ہے، آتش اُن دنوں جوان بھی تھا اور ڈپٹی کمشنر بھی اور میں ایک جلسے کی صدارت کر رہا کہ جس میں ٹوائن بی مہمانِ خصوصی تھے۔ میں اِس جلسے کی صدارت کے اعزاز سے خوش تھا مگر دل میں ایک چبھن اور اداسی بھی تھی۔ مجھے رہ رہ کر ایک انگریز افسر کا طنزیہ جملہ یاد آتا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ ٹوائن بی کے مطالعۂ تاریخ کے خلاصے کی پہلی جلد تم نے ناحق خریدی ہے۔ ایسی کتاب کے مطالعے کے لیے جو فرصت، رغبت اور اہلیت چاہیے وہ سرکاری ملازم کے حصے میں نہیں آتی۔ میں نے اِس جملے کا طنز مدت تک برداشت کیا مگر اِس رائے سے اتفاق نہ کیا۔ ایک بار فرصت ملی تو میں نے بڑی رغبت سے اِس مصنف کو پڑھ ڈالا۔''

''ٹوائن بی کی تقریر ختم ہوئی تو میں نے اُسے اساتذہ، طلباء اور ملتان کے زمینداروں سے باتیں کرتے دیکھا۔ ہر شخص پر اُس نے پوری پوری اور علاحدہ علاحدہ توجہ دی۔ بات غور سے سنی، جواب نرمی سے دیا...... کسی بات پر اختلاف ہوا یا کوئی کج بحثی پر اتر آیا تو اِس تحمل سے سنا کہ اُسے حیرت ہو گئی...... یہ بتایئے کہ آپ کے شہر (ملتان) میں چھوٹی اینٹ کے مکان کس زمانے کے بنے ہوئے ہیں؟ اب آپ کے یہاں تعزیے نکلنے پر جھگڑا کیوں نہیں ہوتا؟ کیا ملتان شیعہ کلچر کا اہم مرکز ہے؟ آپ کے یہاں زمینداری اور پیری مریدی کا کیا تعلق ہے؟ آپ کی نظر میں اسلام کا کیا مستقبل ہے؟...... جلسہ ختم ہوا تو وہ ایک مقامی ہیڈ ماسٹر کے ساتھ اندرونِ شہر اُن کی حویلی میں ٹھہرنے کے لیے چلا گیا۔ وہاں تک تو سواری بھی نہیں جاتی۔ تنگ گلیوں، اُبلی نالیوں اور اونچی دیواروں کے اُس محلے میں چند دن بڑے مزے سے رہا...... میں نے جیب سے آٹوگراف بک نکالی، ٹوائن بی نے قلم کھولا، دستخط کیے، عیسوی تاریخ لکھی، سر اُٹھایا اور مسکرا کر کہا میں ہجری سن بھی لکھنا چاہتا ہوں۔ آپ بھی اسلام اور اِس کے مستقبل پر گفتگو کر رہے تھے بتایئے کہ ہجری سن کون سا ہے؟ میں خاموش ہو گیا۔ ٹوائن بی نے فوراً سر جھکا لیا، اُس کا اشارہ واضح تھا۔ اسلام کی تاریخ وہ لوگ کیونکر بنا سکتے ہیں کہ جنہیں (اسلامی کیلنڈر کی) تاریخ تک یاد نہ ہو۔ صرف باتیں بنانے سے کہیں تاریخ بنا کرتی ہے؟ ٹوائن بی نے 29 فروری 1960ء کے نیچے یکم رمضان 1339ھ لکھا اور موضوع بدل دیا......

میں نے اُنہیں اُس دن کے بعد ایک روز واشنگٹن میں دیکھا۔ وہ عالمی خوراک کانگریس میں قحط اور انسان کی تاریخ کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے۔ میرے اور اُن کے درمیان ایک ہزار کا اجتماع حائل تھا۔ میں نے اُن تک پہنچنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ جب بھی جی چاہتا ہے کہ اُن سے ملاقات کروں تو میں ''مطالعۂ تاریخ'' اُٹھا لیتا ہوں۔''

سو عباس خان سے بھی ملاقات کی سرِ دست یہی صورت ہے کہ اُن کی کتابوں کے آئینے میں اُن کے فکری خدوخال کو تلاش کیا جائے اور عباس خان نے بھی اپنی اِس کتاب میں فلسفے ایک اور نامور فلسفی اور

گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے استاد، علی عباس جلالپوری کو بھی جا بجا دل کھول کر خراجِ تحسین پیش کیا ہے......(یا حسرتا! اتنا بڑا عالم، اتنی کتب کا مصنف اور اس قدر خموشی سے اس دنیا سے چلا گیا کہ ہمیں کئی دنوں بعد ایک غیر ملکی (برطانوی نشریاتی ادارے BBC سے) پتہ چلا......موت العالِم موت العالَم:)

چلتے چلتے ٹوائن بی کے حوالے سے مزید عرض کروں کہ گذشتہ صدی کا یہ نامور ترین مؤرخ، 1955ء میں، پاکستان کے بارے میں اپنے ایک مضمون Pakistan as an Historian sees her (مشمولہ: Crescent and Green-A miscellany of writings on Pakistan) میں بجا طور پر اِن خدشات کا اظہار کیا (اور وہ خدشات بعد ازاں سچ ثابت ہوئے) کہ اگر پاکستان کی سیاست میں مذہب اور لسانیت کا عمل دخل نہ رکا تو پاکستان جلد ہی ٹکروں میں بٹ جائے گا اور چشمِ فلک نے دیکھا کہ محض سولہ سال بعد 1971ء میں پاکستان دولخت ہو گیا۔ ٹوائن بی نے مزید کہا کہ پاکستان میں اگر مستقل سنی (وہابی) فرقے کا غلبہ رہا اور (وہابی) عرب کی طرف جھکاؤ برقرار رہا تو فرقہ واریت کا عفریت بے قابو ہو جائے گا اور شیعوں، احمدیوں اور دیگر مذہبی اقلیتوں کے لیے زندگی مشکل ہو جائے گی اور پاکستان کے لیے بہت بڑی بدقسمتی ہو گی اگر "اسلامی پاکستان" میں دیگر مذاہب اور اقلیتی فرقوں کی زیست دشوار تر ہو گئی۔

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں آں قصۂ پارینہ را

اسی کتاب "سچ" میں عباس خان مذاہبِ عالم کے بارے میں لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اب ہم وہاں چلتے ہیں جہاں دم مارنے کی اجازت نہیں، جہاں فرشتوں کے پر جلتے ہیں، جہاں احکامات اٹل ہیں اس لیے کہ امن کا سانس لیا جا سکے لیکن افسوس کہ انسان نے اِن کو بھی اپنی فطرت کے تابع کرنے کی کوشش کر رکھی ہے۔ یہ عالمِ مذاہب ہے۔ مختصراً نظر ڈالتے ہیں۔"

اس باب میں صرف مولانا روم کا تبصرہ کافی ہے:

من ز قرآں مغز را برداشتم
استخواں پیشِ سگاں انداختم

زخم گواہ ہیں

عباس خان کا یہ ناول ہمارے نظامِ عدل کا ایک نوحہ ہے کہ جس میں دو غریب خاندانوں کو کورٹ کچہری میں اپنا سب کچھ لٹاتے دکھایا گیا ہے اور یہ سب کچھ انصاف کی فراہمی کے نام پر کیا گیا۔ ہمارے معاشرے میں قانون و انصاف کے نظام میں پائی جانے والی خرابیوں کو تمثیلی انداز میں بطورِ احسن دکھایا گیا ہے۔ عدالتی جبر، قانون و انصاف کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو بڑے مؤثر اور گاہے طنز کے پردے میں بیان کیا گیا ہے۔ جزئیات نگاری پر کہیں کہیں ضرورت سے زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اور بعض مقامات پر سیریس قسم کی ایڈیٹنگ کی ضرورت تھی مثلاً صفحہ نمبر 24 تا 35 قطعاً غیر ضروری تفاصیل در آئی ہیں۔ ملک عبدالعلی ایڈووکیٹ جیسے چالاک اور گھاگ وکلاء اور نچلے درجے کے عدالتی و قانونی اہلکاروں کے طریقۂ واردات کو بڑی مہارت سے آشکار کیا گیا ہے لیکن بنظرِ انصاف دیکھا جائے تو اپنے پیشے کے ساتھ انصاف کرنے والے قابل اور دردمند وکلاء کے کردار کو یکسر نظر انداز کیا گیا ہے۔ ساہیوال کے مرحوم چوہدری نور الٰہی ایڈووکیٹ جیسے خدا ترس وکلاء کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس کتاب میں "عدالتی اردو" کے "نادر نمونہ جات" بھی دیے گئے ہیں جن کو کسی سنجیدہ یا مزاحیہ مقالے کی صورت دی جا سکتی ہے نیز یہ کہ اس ناول میں خرابیوں اور برائیوں کو تو بھرپور طریقے سے اجاگر کیا گیا ہے لیکن صورتِ احوال کی اصلاح کی کوئی بین السطور تجویز بھی کہیں نظر نہیں آئی۔

خواہشوں کی خانقاہ

عباس کی مختصر فلسفیانہ تحریروں کا مجموعہ ہے، جس میں خان صاحب نے، ہماری تاریخ کے گمنام جھروکوں سے کچھ اجلے اجلے کرداروں کو اپنے اصل تناظر میں پیش کیا ہے جیسا کہ شیرِ بنگال مولوی فضل حق، مدر ٹریسا، شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد، ڈاکٹر ابوالکلام (صدر ہندوستان) وغیرہم......محمود غزنوی کی بیجا تعریف و توصیف کی گئی ہے، وہ اول تا آخر ایک جارح اور موقع پرست حکمران تھا جس کو اِس بیان میں شک ہو اُس پر لازم ہے کہ وہ فردوسی کی سرگذشت پر بھی ایک نگاہ ضرور ڈالے۔

اِس کتاب میں خان صاحب نے ہندوستان کی فلمی موسیقی کے روشن باب سے اپنی مناسبت کے اعلیٰ ذوق کا مظاہرہ سہگل، اور مبارک بیگم کو یاد کرتے ہوئے کیا ہے۔ علاوہ ازیں عباس خان کے فارسی شعر کا اعلیٰ ذوق برجستہ فارسی اشعار کے حوالوں میں دکھائی دیتا ہے؛ سعدی و حافظ تو گویا اُن کے محبوب شعراء ہیں۔

تنسیخِ انسان

عباس خان کے افسانوں کا مجموعہ ہے، جس میں خان صاحب نے حسبِ معمول اور حسبِ ذوق تاریخ، فلسفہ اور معروضی حالات کے تانے بانے سے کہانیوں کی بنت کی ہے۔ کہیں کہیں اِن افسانوں میں ابوالعلا معرّی کا ذکر بھی آیا ہے؛ یاد رہے کہ معرّی عرب شاعری کی روایت میں پہلا شاعر تھا کہ جس نے فلسفے کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا تھا؛ وہ اپنے سامعین

سے کہا کرتا تھا کہ تمہارا کام یہ ہے کہ میرے کلام کو یاد کرو اور اِس کی آگے روایت کرو، مجھے پڑھنے اور سمجھنے والے اور سمجھنے والے اگلے زمانوں میں آ جائیں گے۔ بلاشبہ عباس خان کی صحیح معنوں میں ابھی دریافت ہونا باقی ہے۔

اِس افسانوں میں لامحالہ طور پر، کہیں کہیں والٹیئر (Voltaire) کا سا (طنزیہ) استدلال اور اندازِ تحریر جھلکتا ہے اور گاہے موپاساں (Maupassant) کی تحریروں کا بھی عکس دکھائی دیتا ہے (مثلاً "وصیت") لیکن عباس خان کا اپنا عمیق مشاہدہ اپنا الگ رنگ دکھاتا ہے لیکن بااین ہمہ اِن افسانوں میں کفایتِ لفظی سے اکثر صرفِ نظر کیا گیا ہے اور بالخصوص "الربتہ چہارم" اور "خاک کا ڈھیر" میں اختصار کی بہت زیادہ گنجائش تھی اور اِن افسانوں پر غالباً عباس خان نے نظرِ ثانی نہیں کی۔"

میں اور امراؤ جان ادا

عباس خان صاحب کا یہ ناول، مرزا ہادی رسوا کے کردار امراؤ جان ادا کے کردار کی ایک توسیع ہے۔ سیف الملوک کے ہیرو کی طرح امراؤ کی تصویر کو دیکھنے کے اشتیاق میں متعدد خواتین سے عشق و محبت کے مراحل سے یکے بعد دیگرے گذرتا ہے۔ اِس ناول میں جہاں بے شمار تاریخی حوالے قاری کی یادداشت میں ستاروں کی طرح چمکتے جاتے ہیں وہیں اِس ناول کے زیریں تموجات میں، فلسفہ، تاریخ، مذاہب، تاریخ، سماجیات اور عصری شعور کے دھارے ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے ہیں اور گاہے اِن کی آمیزش سے ایک نئی قوسِ قزح تشکیل ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ناول کے تقابلی تناظر میں "کئی چاند تھے سرِ آسماں" والے شمس الرحمٰن فاروقی سنجیدگی اور متانت کی تصویر بنے دکھائی دیتے ہیں اور کہیں منیر نیازی زیرِ لب مسکراتے ہوئے نظر آتے ہیں:

"خوبصورت عورتیں
کھڑکیوں جھروکوں میں
گُل ہوا کے جھونکوں میں
بن سنور کے بیٹھی ہیں
مختلف زمانوں میں
تن بدلنے جاتی ہیں
تن بدل کے آتی ہیں
اور بیٹھ جاتی ہیں
کھڑکیوں جھروکوں کے
دلنواز دھوکوں میں"

عباس خان نے بجا طور پر اِسی ناول میں کہیں لکھا ہے:

روئے نکو معالجۂ عمرِ کوتاہ است
این نسخہ از بیاضِ مسیحا نوشتہ ایم

حافظ شیرازی کی ایک اور معروف غزل کے اشعار بھی نقل کیے ہیں لیکن اِسی غزل کا جو شعر نقل نہیں وہ شعر تو حسبِ حال ہے:

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو
رندی و ہوسناکی در عہدِ شباب اولیٰ

حرفِ آخر

عباس خان صاحب سے ایک نہایت مختصر ملاقات اور اگلے دس پندرہ دن اُن کی کتابوں کے ساتھ بسر کرنا ایک عجب سرشاری سے ہمکنار کر گیا؛ اِن کیفیات کا بیان تفصیلاً تو کجا اجمالاً بھی ناممکن ہے، بس چند فارسی اشعار شاید کفایت کر سکیں:

دو یارِ زیرک و از بادۂ کہن دو منے
فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے
(حافظ شیرازی)

تلقین درسِ اہلِ نظر یک اشارت است
کردم اشارتے و مکرر نمی کنم
(حافظ شیرازی)

عباس خان نے گاہے حسن و عشق کے معاملات کو بھی "نہایت ملفوف" انداز میں بیان کیا ہے جن سے کوئی غیر سالک ہرگز آگاہ و آشنا نہیں ہو سکتا: اور ہم جیسے "فارسی نیم خواندہ" لوگوں کی بدقسمتی ہے کہ ہم کسی کو حافظ کا یہ شعر سنائیں کہ:

گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر
تا سحر گاہ ز کنارِ تو جواں برخیزم
(حافظ شیرازی)

اور وہ آگے سے یہ کہہ دے کہ اِس کا ترجمہ بھی کر دیں تو..... "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" والا معاملہ ہو جائے گا؛ سو "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود، گل و خود چاک" والی کیفیت رہ جاتی ہے:

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز رسم و راہِ منزلہا
حضوری گر ہمی خواہی از اُو غائب مشو حافظ
متیٰ ما تلق من تہویٰ دع الدنیا و اہملہا

عباس خان کی دیگر تصانیف میں "خاک کا ڈھیر"، "تُو اور تُو"، "اُس عدالت میں"، "جسم کا جوہڑ"، "قلم کری اور وردی"، "دھرتی بنام آکاش" وغیرہ تک رسائی نہ ہو سکی سو اُن کے بارے میں تشنگی رہے گی۔

پیر و مرشد انعام اللہ خان کا صدقِ دل شکریہ ادا کرنا واجب ہے کہ جنہوں نے بھکر کی سیاحت اور عباس خان صاحب کی زیارت کے اسباب پیدا کیے اور قریشی منظور صاحب کے لیے محبتیں کہ وہ اِس سفر میں ہمارے ساتھ شریک ہوئے؛ اور فرحت پروین سے ڈھیر سارے شکوے اور شکایات کہ اُنہوں نے اپنے شہر کے اتنے بڑے فلسفی اور اہم لکھاری کو، ہم جیسے نالائق طالب علموں سے، ابھی تک، بعنوانِ شائستہ، روشناس کیوں نہ کروایا.....

نہ جانے رہ رہ کر اپنا یہ شعر کیوں یاد آتا ہے:

دیکھ ہم لوگ کل نہیں ہوں گے
آج فرصت ملے تو آ جاؤ
(ڈاکٹر کوثر محمود: امروز ۲۰ جنوری ۲۰۱۹ء)

نیاز احمد......ایک منفرد موسیقار، ایک منفرد دوست

بختیار احمد

نیاز احمد صاحب سے مجھے متعارف ہوئے تقریباً سینتالیس (2018-1972) برس ہو چکے ہیں اور اتنے ہی برس ہماری دوستی کو۔ کسی انسان کو جاننے کے لئے ویسے تو ایک عمر چاہئے مگر کھرے انسان کو جاننے کے لئے اس سے تعارف اور اس کے بعد صرف پانچ منٹ درکار ہوتے ہیں۔ تو نیاز صاحب کو حساب کتاب کی رو سے جانتے ہوئے مجھے ا?ج پانچ منٹ کم سینتالیس برس ہو رہے ہیں۔ صرف اس لئے کہ نیاز صاحب بہت کھرے اور کھرّے انسان ہیں۔ صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہنے کے "اعلیٰ مرض" میں مبتلا ہیں۔ اسلئے تمام مریض قسم کے انسانوں کو وہ ضرورت سے زیادہ صحتمند لگتے ہیں اور لگنے بھی چاہئیں کہ یہ مریض کو مریض اور ڈاکٹر کو ڈاکٹر سمجھتے چلے ا?ئے ہیں۔

نیاز صاحب سے مجھے ایک خاص نسبت بھی ہے۔ وہ یہ کہ نیاز بھی کیرانا والوں کے شاگرد ہیں اور میں بھی اسی گھرانے کا ایک معمولی سا شاگرد ہوں۔ گویا ہم دونوں ایک ہی تیرِ محبت کے ہدف ہیں۔

نیاز احمد صاحب کی کمپوز کی ہوئی دھنیں مجھے بیشک سب کی سب یاد نہ ہوں مگر میں ان کی بنائی ہوئی دھنیں اکثر گنگناتا رہتا ہوں۔

ہمارے پیارے پاکستان میں ایک سے ایک بڑھ کر میوزک کمپوزر گذرے بھی ہیں اور موجود بھی ہیں۔ ہر ایک کی اپنی پہچان ہے۔ یہ بڑے بڑے نام ایسے ہیں کہ موسیقی سے ذرا سا بھی مس رکھنے والے ہوں یا صرف سُننے والے، سب کے سب ان کے سحر میں مبتلا رہتے ہیں۔ مثلاً ماسٹر غلام حیدر صاحب، جناب فیروز نظامی صاحب، خواجہ خورشید انور صاحب، رشید عطرے صاحب، صفدر حسین صاحب، ماسٹر عبداللہ صاحب، خلیل احمد صاحب، مہدی ظہیر صاحب، عاشق علی خاں صاحب، رفیق غزنوی صاحب، حسن لطیف للک صاحب، بابا چشتی صاحب، اختر حسین اکھیاں صاحب، سلیم اقبال صاحبان، اے حمید صاحب، دیبو بھٹا چاریہ صاحب، طفیل نیازی صاحب، رفیق علی صاحب، میاں شہریار صاحب، نثار بزمی صاحب، ماسٹر منظور صاحب، نذر حسین صاحب، مجاہد حسین صاحب، سہیل رعنا صاحب، روبن گھوش صاحب، وجاحت عطرے صاحب، نذیر علی صاحب، وزیر علی صاحب، طافو صاحب، کریم شہاب الدین صاحب، فیروز دین صاحب اور بہت سے اور جن کے نام اس وقت ذہن میں نہیں آ رہے۔ ان تمام مشاہیر، استادانِ فن اور اعلیٰ پائے کے موسیقاروں کی صف میں شامل ہونا میرے نزدیک نیاز احمد کا کارنامہ ہے۔

نیاز احمد نے اپنی انفرادیت یوں بھی قائم کی کہ اپنے ا?پ کو سخت گیر کمپوزرز میں شامل کیا۔ عمومیت سے پرہیز برتا۔ خصوصیت اور معیار کو پہچان بنایا اور بے شمار خوبصورت دھنیں ترتیب دیں۔ کلاسیکی، نیم کلاسیکی سے لے کر پاپ تک سب میدانوں میں طبع ا?زمائی کی اور خوب خوب کی۔ نئے گانے والوں اور گانے والیوں کو متعارف کرایا۔ بل کہ خود اپنے ا?پ کو بھی گلوکار کے طور پر خود ہی متعارف کرایا۔ میں نے جہاں بعض موسیقاروں کو خود گانے سے پرہیز کرتے دیکھا ہے وہاں اکثر کو بہترین گلوکار بھی پایا ہے۔ مثلاً میرے محترم اُستاد جناب فیروز نظامی صاحب، نثار بزمی صاحب، نذر حسین صاحب، ماسٹر منظور صاحب اور بہت سے دوسرے موسیقار۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جو دھن موسیقار بناتا ہے بہت کم گلوکار سو فی صد اُسے نبھا پاتے ہیں۔ یہ اچھی بات ہے کہ ا?ج ہمیں ایک موسیقار گلوکار کو سننے کا موقع مل رہا ہے۔

موسیقی، بقول نیاز احمد وہ علم ہے جو برتا جائے تو ہی پڑھا جا سکتا ہے۔ اور بات ہے بھی صحیح۔ لیکن ہمارے ا?ج کے بیشتر گانے والوں نے اس بات کی رمز کو تو سمجھا نہیں اور نام کما کے بھی نہیں سیکھا۔ اور نام بھی کیا کمایا بس نام کا نام کمایا، کام نہیں کمایا۔ اور اس کام کو جو دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ہے ا?سان سمجھا۔ نیاز احمد نے ایک بار کہا تھا "مشکل اسی کے لئے ہوتی ہے جو کام جانتا ہے" سو نیاز کو بھی اور نیاز کی قبیل کے تمام جانکاروں کو اپنے کام میں مشکل ہی پیش ا?تی ہے۔

یہاں میں ایک اشکال کو دور کر دوں۔ یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور لکھ بھی دیا ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام میں موسیقی حرام ہے۔ یہ بات وہ عالم بھی کہتے پائے گئے ہیں جو خود لہک لہک کر فلمی گیتوں کی طرز پر نعتیں گاتے رہتے ہیں اور ا?ج کل تو ماشاء اللہ ان کی چاندی ہی چاندی ہے بلکہ سونا ہی سونا ہے۔ تو اس سلسلے میں میرا کہنا یہ ہے کہ دنیا میں گناہ

اور ثواب کا کوئی کام ایسا نہیں جو اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ نے ہر انسان کے بس میں نہ کر رکھا ہو۔ مگر یہ فن و ہنر اللہ تعالیٰ ہر انسان کو عطا نہیں فرماتا۔ گلے میں سُر ہر کسی کو عطا نہیں ہوتا، کمپوزیشن کسی کسی کے بس کی بات ہے۔ اسے طرح دیگر فنون۔ تو حضور اللہ تعالیٰ ظالم نہیں ہیں کہ یہ گناہ کا کام بعض انسانوں کو خود عطا کر دیتے۔ ہاں ان فنکاروں کی ذمہ داری بڑی ہے۔ کہ اللہ کی عطا کا استعمال کیا کرتے ہیں۔ گناہ کے کام میں یا ثواب کے کام میں۔ اور اس کام کا نتیجہ کیا برا? مد ہوتا ہے!

موسیقی کے شعبے سے تعلق رکھنے والے ہمارے تقریباً تمام ہی فنکار، وہ گویتے ہوں یا سازکار، موسیقار ہوں یا رقاص عام طور پر کریلے گوشت اور دھنیا گوشت کا لذیذ ذوق رکھنے کے ساتھ ساتھ لطیفے سننے، بل کہ زیادہ تر سنانے کے شوقین بھی ہوتے ہیں۔ یہ شوق نیاز صاحب کو بھی ہے۔ مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کے سنائے ہوئے لطیفے ہر چند بہت اچھے ہوتے ہیں مگر یہ خود اسقدر ہنستے ہوئے لطیفہ سناتے ہیں کہ سننے والا اور لطیفہ دونوں منہ بسورنے لگتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ سُر میں ڈوبا فنکار جب اچھے لگاؤ، اعلیٰ برتاؤ اور پُرسوز سبھاؤ پر اپنے رونگٹے کھڑے کر بیٹھے اور رقیق ہوجائے تو وہ لطیفہ گو نہیں رہ سکتا۔ ماسٹر عبدا? کے بنائے مکھڑے "دے تو ا? ذ نا سی، وے تو مُیں ا? یا" پر میں نے نیاز کو رقیق ہوتے دیکھا ہے۔ ماسٹر منظور صاحب کی دھنوں پر سر دھنتے دیکھا ہے۔ بہترین کمپوزیشنز پر داد دیتے دیکھا ہے۔ تو نیاز وہ موسیقار ہے جو دوسرے موسیقاروں کو دل سے داد دیتا ہے۔

نیاز میں ایک اور نقص بھی ہے، وہ اپنا اتنا پروموٹ نہیں ہے جتنا دوسروں کا۔ کئی موسیقاروں کے لئے وہ خود سفارش کرتا ہے کہ ان سے کام لیا جائے۔

میں نے پاک چائنا کو پروڈکشن 'رشتے اور راستے' کی موسیقی کے لئے جناب نثار بزمی سے درخواست کی جو انہوں نے کمال محبت سے قبول فرمالی۔ بعد میں نیاز سے ملاقات ہوئی تو میں نے معذرت چاہی کہ ہرچند تم میرے دوست ہو مگر میں نے مناسب یہی خیال کیا کہ اس قدرے مشکل کام کو تم سے بڑے موسیقار کے سپرد کروں۔ نیاز کی حالت دیدنی تھی۔ وہ جذباتی ہوگیا۔ اس نے پورے خلوص سے میرے انتخاب کو سراہا اور کہا کہ ہاں وہ بہت بڑے موسیقار ہیں اور بڑا کام انہی کا حق ہے۔ اس کا خلوص اس کی گہری ا? نکھوں سے جھلک رہا تھا۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میں اور نیاز احمد ٹیلی وژن ڈراموں کے لئے اوریجنل پس منظر موسیقی کی ابتداء کرنے والوں میں سے ہیں۔ چنانچہ جب نیاز نے "جو گہرائی میں گئے" کی موسیقی ترتیب دی تو اس موسیقی کا اسقدر شہرہ ہوا کہ ہمارے کئی ٹیلی وژن سینٹر اس موسیقی کو بعد میں بھی کئی مواقع پر استعمال کرتے رہے۔ ایک بار جب یوم اقبال پر پروگرام کے لئے نیاز صاحب کلام اقبال ? کی کمپوزیشنز تیار کر رہے تھے تو غالباً محرم کا مہینہ تھا اور سازوں کا استعمال محلِ نظر تھا۔ لہٰذا بغیر سازوں کے کلامِ اقبال چھ گلوکاروں سے گوایا گیا اور مجھے بہت سے سال گزرنے کے بعد بھی ا? ج تک "ا? سماں ہوگا سحر کے نور سے ا? ئینہ پوش، اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائے گی" کی دھن بخوبی یاد ہے۔ کیا خوبصورت دھن ہے۔ اسی طرح ان کی بنائی ہوئی ایک غزل مجھے اکثر ہانٹ کرتی ہے:

جب تیری یاد کا طوفان گذر جائے گا
دل کسی اور سمندر میں اتر جائے گا
اپنے حالات سے میں صلح تو کرلوں لیکن
مجھ میں اک شخص جو زندہ ہے وہ مرجائے گا

سبحان اللہ! پھر

تمہارے شہر کا موسم بڑا سہانا لگے
میں ایک شام چرالوں اگر برا نہ لگے

کی دھن۔ اور صبا اکبرآبادی صاحب کی غزل:

تری نظر ہے میرا دل ہے، کیا کیا جائے
جنوں خرد کے مقابل ہے، کیا کیا جائے
ہم اپنے غم کا فسانہ سنانے آئے تھے
مگر یہ آپ کی محفل ہے' کیا کیا جائے

کی کمپوزیشن۔ دھن بنانے میں مزاجب ہی ا? تا ہے جب الفاظ سروں کا لباس پہنے نظر آئیں۔ مثلاً غالب نے کہا،

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

تو نیاز صاحب نے جو دھن بنائی اس میں لگا کہ غالب؟ اس بھری دنیا سے التجا کر رہا ہے کہ اس کے دکھ کی دوا کرنے کو کوئی تو مسیحا نظر ا? جائے۔

مجھے یہ فخر بھی حاصل ہے کہ میں نے بھی نیاز صاحب کی دھنوں پر گیت گائے ہیں۔ مہناز صاحبہ کے ساتھ ایک کیسٹ بنایا گیا تھا اور اس میں چند گیت اور ایک دوگانا مہ ناز صاحبہ مرحومہ کے ساتھ میں نے بھی

گایا تھا۔ کیسٹ کا عنوان تھا "ا؟ئی رین سہاگ کی"۔ چوں کہ نیاز صاحب اس واردات میں مجھ سے زیادہ خود کفیل ہیں لہٰذا اسقدر تابدار اور خوشبودار دھنیں ترتیب دیں کہ گانے والوں اور سننے والوں، سب کو ایک کیف میں ڈبو دیا۔ اب دیکھیے صلاح الدین مرحوم نے کہا، "ا؟ئینہ چھن سے ٹوٹ گیا"۔ تو نیاز صاحب نے اس کو یوں کمپوز کیا کہ ا؟ئینہ واقعی چھن کر کے ٹوٹ گیا۔

یاد آنے کو یاد آئیں مگر
سب یادیں چپ چپ لگتی تھیں
میں اپنے گھر میں اکیلا تھا
چپ سادھے ان کو تکتا تھا
آئینہ نہیں دیکھا پھر بھی
آئینہ چھن سے ٹوٹ گیا

اپنے ماشاءاللہ سمارٹ جسم اور درمیانے سے قدرے کم قد کے باوجود نیاز احمد بہت مضبوط انسان ہیں۔ اگر یہ مناسب لوگوں سے ربط بڑھا لیتے تو ا؟ج کامیاب ڈاکو بھی ہو سکتے تھے۔ تاہم اپنی بے لاگ، معصوم اور بچی غنڈہ گردی میں اب بھی بہت کامیاب ہیں۔ چنانچہ اکثر سازندوں، بیشتر افسروں اور کئی مافیا گاڈ فادروں کو میں نے ان سے ڈرتے دبکتے دیکھا ہے۔

ایک زمانے میں نیاز صاحب حسن اسکوائر پر واقع ایک تکے کباب والے کے ہاں گل چھرے اُڑانے جایا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک روز جب مجھے اور عارف رانا کو ان کی یاد نے بے تاب کیا تو ہم ان تکے کباب والے کے ہاں پہنچے اور خالص غنڈوں کے انداز میں ان سے پوچھا۔ "سلاما لیکم۔ وہ آیا نہیں ابھی؟" اُس نے حیران ہو کر اور قدرے دب کر پوچھا "کون جناب؟" "وہی جو غنڈہ بنا پھرتا ہے اور اپنے ا؟پ کو نیاز کہلواتا ہے"۔ وہ ہنس ہنس کے دہرا ہو گیا اور ہم بھی غنڈہ پن سے واپس اپنے لبادے میں آ گئے۔

ایک روز میں اور عارف ہاشلیم لیاقت ا؟باد کے ایک ساز ساز یعنی ساز بنانے والے صاحب کے ہاں سے دو عدد ہارمونیم خرید کر ا؟ رہے تھے کہ مجھے نیاز صاحب کا ہارمونیم یاد ا؟ گیا۔ میں نے عارف کو بتایا کہ بہت ہی خوبصورت ہارمونیم ہے۔ اور ساتھ ہی موبائل فون نکال کر نیاز صاحب کا نمبر ملایا۔ میں نے اپنے سٹیج ڈرامے "اک خواب سا لگتا ہے" کے لئے مرزا غالب کی ایک اچھوپ غزل کی دھن بنائی ہوئی تھی۔ نیاز صاحب نے فون ا؟ن کر کے "ہیلو" کہا اور ادھر میں نے

آمد خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست
دُودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست

گانا شروع کر دی۔ جیسے ہی میں نے سنچائی ختم کی۔ نیاز جو اس دوران گُم سُم میری کمپوزیشن سن رہا تھا، ہنس ہنس کے دہرا ہوتا مجھے فون پر بھی نظر آ گیا۔ لیکن میرے بارے میں نیاز اس قدر خسیس واقع ہوا ہے کہ میری بنائی دھن کی داد نہ دی البتہ میرے اچھوتی قسم کے فون کرنے پر بے تحاشا داد دیتا رہا۔ اُس نے اعتراف کیا تھا کہ ایسا ٹیلی فون اس نے زندگی میں پہلی بار سنا ہے۔

آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ میں نیاز کو کہیں تو صاحب کہتا آیا ہوں اور کہیں صرف نیاز۔ تو اسکی وجہ میری سمجھ میں یہی ا؟ئی ہے کہ جب میں نیاز کے فن کو دیکھتا ہوں تو نیاز صاحب کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں اور جب اسکی دوستی کو دیکھتا ہوں تو جی چاہتا ہے اوئے نیاز کہہ کر پکاروں۔ اسی لئے میں نے عرض کیا تھا، نیاز۔ ایک منفرد موسیقار ایک منفرد دوست۔

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیرِ ادارت شائع ہونے والا مجلّہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ اٹھارہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے
اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

ایک روشن دماغ تھا......نہ رہا

اقبال راہی

میاں منظور شاہد (مرحوم) کی پہلی برسی پر خصوصی مضمون

یہ کوئی سات برس پہلے کی بات ہے' پی ٹی وی پر ایک مذاکرہ تھا جس میں' میں بھی شریک تھا' وہاں میری ملاقات جناب خورشید احمد بٹ سے ہوئی' جو اظہار خیال کے لئے تشریف لائے تھے' پروگرام کے بعد ان سے مفصل تعارف ہوا تو پتہ چلا وہ ایک معیاری میگزین ماہنامہ ''تارکین وطن'' میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں' ساتھ ہی بٹ صاحب نے آفس میں آنے کی دعوت دی' میں دو چار دن بعد جب 49 کشمیر بلاک علامہ اقبال ٹاؤن پہنچا تو بٹ صاحب نے آفس میں تشریف فرما میاں منظور شاہد سے میرا تعارف کرایا' میاں صاحب نے مخلصانہ انداز میں بیٹھنے کو کہا اور گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا جب میں نے بتایا کہ میں حضرت احسان دانش کا شاگرد ہوں اور میری تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں تو میاں صاحب بڑے خوش ہوئے اور مجھے تازہ شمارہ عطا کیا اور بولے اس میں ایک گوشہ ادب کے لئے بھی رکھا ہے پہلے اسے اقبال نواز ترتیب دیتے تھے پھر سعد اللہ شاہ کے سپرد کیا اب میں چاہتا ہوں کہ یہ ڈیوٹی آپ سنبھال لیں میں نے اسے اپنی خوش بختی سمجھ کر ہاں کر لی اور دوسرے دن سے میں آفس آنے لگا۔ میاں منظور شاہد صاحب بڑے مخلص انسان' دوستوں کے دوست اور ہر ایک کی شکل میں کام آنے والے باوقار انسان تھے' انہوں نے ایک کتاب جس میں وہ مضامین تھے جو میگزین میں شائع ہوتے تھے' رنگ چمن کے نام سے لکھی' دن اور مہینے گذرتے گئے' تقریبات میں بھی ان کے ساتھ جانے لگا' انہیں ہر موضوع پر دسترس حاصل تھی' وہ اتنے نفیس انسان تھے کہ جب آفس سے گھر جاتے تو مجھے ساتھ لے کر جاتے اور گھر کے قریب اُتار دیتے' ان کے آفس میں دوستوں کی آمد و رفت تمام دن جاری رہتی ان کے لئے چائے وغیرہ کا خاص اہتمام کر کے بہت خوش ہوتے تھے' حساس اتنے تھے کہ ایک مجھے ڈینگی بخار نے آلیا' طبیعت کافی خراب ہوئی انہیں پتہ چلا تو وہ ایک بڑا گلدستہ لے کر غریب خانے پر تشریف لائے' میری خوشی کی انتہا نہ رہی ان کا چہرہ دیکھ کر میری آدھی بیماری جاتی رہی' ایک بار میری نواسی فرا ہانیوں جگر کی خرابی کے باعث میو ہسپتال داخل تھی' میاں صاحب کو علم ہوا تو وہ شہزاد لطیف کے ساتھ تشریف لائے چونکہ سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتے تھے اس لئے مجھے نیچے بلایا اور بچی کے علاج وغیرہ کے لئے کچھ عنایت کیا' میں نے شکریہ ادا کیا۔ اسی طرح میری بھانجی کی شادی تھی یہاں بھی انہوں نے اپنا روایتی کردار نبھایا 'غرض وہ کسی کو پریشان ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے وہ اس کے قائل تھے کہ اگر کسی کی مدد کرو تو دوسرے آدمی کو خبر نہ ہو' یہ ایک نیک صالح اور دین پر عمل کرنے والے کی نشانی ہوتی ہے۔ ان کے تینوں بیٹے جناب عباس میاں جناب اعجاز میاں اور جناب فیاض میاں بھی ان کے نقش قدم پر رواں دواں ہیں' وہ اپنے والد محترم کے دوستوں کا اتنا ہی ادب کرتے ہیں جتنا میاں صاحب کیا کرتے تھے' دو سال قبل میاں صاحب کو سانس کی تکلیف ہوئی وہ سروسز ہسپتال بھی داخل رہے' گھر بھی علاج چلتا رہا پھر انہوں نے آفس آنا شروع کیا کچھ ماہ بعد طبیعت پھر بگڑی اس بار وہ گھر پر ہی رہے اور علاج جاری رہا اسی دوران ایک المیہ یہ ہوا کہ ان کی بیماری کے دوران ہی انکی اہلیہ محترمہ اللہ کو پیاری ہو گئیں' انہوں نے جس تحمل اور حوصلے سے یہ صدمہ برداشت کیا اس کی مثال ملنا ناممکن ہے' انہوں نے صرف اتنا کہا کہ خدا کو یہی منظور تھا' ہم کیا کر سکتے تھے' اس حادثے کو کچھ ہی ماہ گذرے تھے کہ ان کی طبیعت پھر بگڑ گئی اور پچھلے برس غالباً 12 یا 13 جنوری 2018ء کو ان کے بیٹے انہیں جناح ہسپتال لے گئے جہاں وہ مختصر عرصہ زندگی اور موت کی کش مکش میں رہنے کے بعد 31 جنوری 2018ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے' اسی روز دوپہر کے وقت سینکڑوں سوگواروں بشمول صحافیوں' شاعروں' ادیبوں اور عزیز و اقارب کی موجودگی میں سپرد خاک کر دیا گیا اس موقع پر رقت آمیز مناظر دیکھنے کو ملے' ہر آنکھ اشکبار تھی' اس موقع پر وہ لوگ بھی موجود تھے جن کی میاں منظور شاہد مرحوم برسوں سے ضروریات پوری کرتے چلے آ رہے تھے' آج میرا اور ان گنت لوگوں کا دل رو رہا ہے کہ اس اخلاق اور ایثار کے پیکر کو دنیا سے رخصت ہوئے پورا ایک برس بیت گیا' میاں منظور مرحوم آج بھی ہمارے دلوں میں موجود ہیں اور جب تک ہمارے دم میں دم ہے موجود رہیں گے' ماہنامہ ''تارکین وطن'' ان کی نشانی کے طور پر آج بھی شائع ہو رہا ہے فرق اتنا پڑا ہے کہ اس کی پیشانی پر چیف ایڈیٹر میاں منظور شاہد کی بجائے اب بانی لکھا جاتا ہے اور اداریئے کے آخر میں ایڈیٹر انچیف میاں منظور شاہد کی جگہ شاہد فیاض حیدر لکھا جاتا ہے' ہم ان کی مغفرت اور بلندی درجات کے لئے دعا گو ہیں کہ ایسے انسان دنیا میں خال خال ہی رہ گئے ہیں۔

حضرت ابرار ندیم اوران کی ''اساں دل نوں مرشد جان لیا'' پر ایک نظر

اطہر جعفری

ابرار ندیم تقریباً سات آٹھ سال سے فیس بک پر مرا دوست ہے۔ یعنی دوستی فیس بک کے سبب ہی ہوئی۔ فون پر رابطہ شاید پانچ برس کا ہو چکا ہے۔ مگر ملاقات ہوئی تو اب، وہ بھی عزیزم وسیم عباس کی مہربانی سے۔ ایسا نہیں کہ ہم نے پہلے کبھی ملاقات کی کوشش نہیں کی۔ کوشش تو بہت کی مگر ہمیشہ مصروفیات آڑے آتی رہیں کبھی میری اور کبھی اس کی۔ اس تعلق کے دوران اس نے بہت سے مراحل طے کیے یعنی اک عام شاعر سے ریڈیو پروڈیوسر اور پھر ''خود ساختہ دانشور'' (پی ٹی وی فیم کردار) اور اب ''اساں دل نوں مرشد جان لیا'' جیسی شاہکار کتاب کا خاص شاعر۔ کتاب تو اس کی اس سے پہلے بھی آ چکی ہے مگر وہ میری نظر سے نہیں گزری۔ ہو سکتا ہے اس میں بھی شاعری اسی معیار کی ہو مگر دل نہیں مانتا کہ ارتقا لازم ہے اور مزید یہ کہ فیس بک پر ابرار کی شاعری جب جب نظر سے گزری اس نے مجھے چونکایا نہیں۔ میں یہی سمجھتا رہا کہ وہ میرے جیسا نام نہاد شاعر ہے یعنی شوقیہ، وقت گزاری کی خاطر خیالات موزوں کرنے والا۔ مگر اب اس ''اساں دل نوں مرشد جان لیا'' سے وہ مجھ سے کوسوں آگے نکل گیا اور ایسا لگتا ہے کہ وہاں کھڑا کہہ رہا ہو کہ ''ہن دسو شاہ جی، شاعر من دے اوناں؟''

ابرار مان تو لیا ہے مگر یار تم نے اپنے حاسدین میں اک اور دوست (تمہاری ہی نظم ''متر'' کے حوالے سے) کا اضافہ کر لیا اور ہاں اب اس کتاب کے بعد کوئی کافر ہی ہوگا جو تمہیں دور حاضر کا بلکہ اگلی کئی نسلوں کا اک بڑا پنجابی شاعر نہ مانے تو میری کیا مجال ہے انکار کی جانی۔ اک ضروری وضاحت کہ میں نے یہاں لفظ کافر، اچھی شاعری کو نعمت اور اس کے کفران کے حوالے سے برتا ہے۔ سو خود کو ہر فتوے سے محفوظ سمجھتا ہوں۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی زیر نگاہ کتاب یعنی حیران کر دینے والی شاعری کے مجموعے کی مگر شاعری کے حوالے سے گفتگو سے قبل میں اس تصویر کا ذکر ضرور کروں گا جسے ابرار نے اپنی کتاب کے آغاز میں چھاپنا ضروری سمجھا اور اسے انتساب قرار دیا۔

وہ واپڈا کالونی بھلوال کے کسی چوراہے کی تصویر ہے جو ابرار کے من میں کہیں نقش ہے ورنہ وہ کبھی اس تصویر کو شامل کتاب نہ کرتا اور ایسا وہی لوگ کرتے ہیں جو دنیا میں کہیں بھی جا بسیں مگر اپنا گاؤں، قصبہ، شہر اپنے ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ ابرار بھی بھلوال اور اس کی گلیاں، اس کی صبح و شام، اس کی فضائیں، اُڑتی دھول، مٹی اور وہ باس جس میں شہری لوگوں کی سانسیں اُکھڑنے لگتی ہیں۔ مگر کھیتوں کھلیانوں میں گھرے چھوٹے شہروں اور دیہی علاقوں میں رہنے والوں کو اسی میں سانس لینا زندگی لگتی ہے۔ لگتا ہے ابرار آج بھی لاہور میں رہتے ہوئے اکثر لحات اسی چاندنی چوک پر اپنے یار بیلیوں کے ساتھ گزارتا ہے۔

لیجیے لکھنا تھا موصوف کی کتاب اور اس کی شاعری پر لکھنے لگ گیا اس کی ذات پر مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں کہ اس کی شخصیت ہی ایسی ہے (ابرار اب لوگ سمجھیں گے کہ مجھے تم سے کوئی کام ہے ہاہاہا)۔

اچھا بس اب بات شاعری پر تو جیسے خوشبو پھیلتی ہے رفتہ رفتہ ایسے ہی مہکتی شاعری بھی اپنا سفر دھیرے دھیرے طے کرتی ہے اور ماحول کو نہ صرف یہ کہ معطر کر دیتی ہے بلکہ وہاں موجود ہر ذی روح کے دل و دماغ پر مثبت اثرات بھی مرتب کرتی ہے۔

ایسے ہی ابرار کی زیر نگاہ شاعری بھی وقت کے ساتھ پھیلتی جائے گی اور جیسے جیسے یہ لوگوں تک پہنچے گی تو سب سے بڑی خاصیت جو مجھے نظر آ رہی ہے وہ اس کتاب میں بہت سے مصرعے ایسے ہیں جو ضرب الامثال بننے کو تیار ہیں۔ بس کچھ وقت لگے گا اب وہ وقت کب آئے گا یہ میں نہیں جانتا مگر اتنا یقین ہے کہ آئے گا ضرور۔

ابرار کی شاعری سادہ وسلیس ہے اور دو ٹوک ہے۔ گویا کوئی فیصلہ سنایا جا رہا ہو یہی سبب ہے کہ ابرار نے اپنی شاعری میں استعاروں اور کنایوں کا سہارا کم کم ہی لیا ہے اور براہ راست بات کی ہے اور انتہائی خود اعتمادی اور سنجیدگی سے کی ہے۔ اتنی گہری اور باریک بین نگاہ سے مشاہدہ

کیا ہے زندگی کا، جذبات واحساسات کا، رویوں کا، قلبی اور ذہنی کیفیات کا، اُلجھنوں کا، مشکلات کا، ہجر ووصال کا کہ اسے ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کہ کسی استعارے یا کنائے کا سہارا لے کہ سچ کسی بیساکھی کا محتاج نہیں ہوتا۔ محبوب ہو کہ دوست یار سب کو کھری کھری سنائی ہیں۔ میرے خیال میں جو شاعر اپنے مشاہدات، تخیلات اور محسوسات کو اپنی شعری قوت سے متاثر کن شعر یا نظم میں ڈھال دے وہی کامیاب شاعر ہے اور یہ صلاحیت موجودہ دور کے بڑے بڑے خودساختہ میر و غالب میں بھی نہیں پائی جاتی اور ابرار کو یہ نعمت بے بہا عطا کی گئی ہے۔

اب آیئے ابرار کا کچھ کلام دیکھتے ہیں۔ یہ مصرع ہیں جو ضرب الامثال کہلائی جائیں گی۔

رہا دِس میں کتھے آں
ایہہ جو میں آں
خورے کی آں
عشق دبارہ ہو سکدا اے
اِیجے گزارا ہو سکدا اے
بھاں تیرا کل نہیں آیا
ہو سکدا اے پیار بھاناں پے جاوے
گھڑیاں نوں جے سانبھ لیے تے
وریاں دا نقصان نہیں ہندا
اس عمروں وڈے روک لیے
اس کھئے جے ڈھگے ساں
کلا بیٹھا بول رہیا واں
سورج ہیٹھاں ڈھرنے پے آں

اوراب کچھ اشعار دیکھتے ہیں:

واعظ اپنے نال برابر تھاں دیویں تے سوچاں گا
پچھے لگ کے نال کسے دے ٹرنا میری فطرت نہیں
ہوئے جے تکلیف کوئی تے ڈھاناں مار کے روناواں
چپ چپیتے کمرے لگ کے کڑھنا میری فطرت نہیں
جس رہ روی ابرار میں ٹرنا اکھیاں میٹ کے ٹرناواں
منزل لبھے یاں نہ لبھے مڑنا میری فطرت نہیں

نظم ''ہار'' تو زندگی کی مکمل تصویر ہے۔ نظم ''سوہنی'' پڑھتے ہوئے بہت لطف آیا کہ ابرار شرعی اور سماجی پابندیوں اور عشق و سرمستی کے تقاضوں کے درمیاں معلق پایا گیا۔ آپ اگر اچھی بلکہ عمدہ شاعری پڑھنا چاہتے ہیں تو یہ کتاب ضرور لیجیے۔ انشاءاللہ مایوس نہیں ہوں گے۔

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	140/- روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	350/- روپے
جاڑے کی چاندنی	غلام عباس	200/- روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	200/- روپے
اُردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	700/- روپے
اُردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	150/- روپے
اُردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	700/- روپے
اُردو غزل (غزل کی دوسوسالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	800/- روپے
مقدمہ شعروشاعری	الطاف حسین حالی	200/- روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	400/- روپے
تنقیدات حسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700 روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	300/- روپے
تحقیق شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	500/- روپے
اصلاح تلفظ واملاء	طالب ہاشمی	250/- روپے
اُردو کے 25 افسانے	ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر	500/- روپے
نیا افسانہ اور قاری	ڈاکٹر طاہر تونسوی	250/- روپے
ولی تحقیق وتنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اشرف خان	250/- روپے
فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر طاہر تونسوی	400/- روپے
داستان اقبال	آمنہ صدیقہ	200/- روپے

ناشر: القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

"نظم کا سچا شاعر"......شہزاد نیّر

محمد شفیق

آرنلڈ نے کہا تھا کہ فن میں منافقت اور بے ایمانی نہیں چلتی۔ کیونکہ اچھا انسان ہی سچا تخلیق کار ہوتا ہے۔ شاعر جس کا مادہ ہی شعور ہے وہ اپنے اردگرد اور اپنی زندگی سے اپنی شاعری کا سامان کشید کرتا ہے اور اس کی تخلیقات متنوع موضوعات ومزاج کا امتزاج ہوتی ہیں۔ ان میں تازہ کاری، شعور کی روشنی اور ایک مضطرب ذہن کا عکس واضح ہوتا ہے۔ اسی تناظر میں شہزاد نیر ہمارے معاشرے کے نہ صرف سچے تخلیق کار بلکہ سچے نباض اور مسیحا بھی ہیں۔ وہ عصر بے چہرہ کو چہرہ دینا چاہتے ہیں اور مسخ شدہ زندگی میں احساس مروت کے رنگ بھر کر خوبصورتی دینا چاہتے ہیں۔

شہزاد نیر کے ہاں نظم کا تجربہ مستعار بھی نہیں اور نہ ہی ان کا یہ دعویٰ میرے علم میں ہے کہ انہوں نے اسلوبیات میں کوئی نیا پیراہن وضع کیا ہے۔ تاہم ان کی شاعری ملائمات کے ساتھ نئے تخلیقی تجربے کی اساس ضرور بنی ہے۔ ان کی نظمیں سریع الفہم ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے منفرد موضوعات، اسلوب کی ندرت اور دردمندی کی ایک زیریں لہر کے سبب ہر کسی کو اچھی لگتی ہیں۔

اردو نظم میں وقت کے مسائل پر فکری اور فلسفیانہ نظم نگاری کی ایک بڑی مضبوط روایت رہی ہے اور شہزاد نیر نے اس تسلسل میں اپنے تخلیقی عمل کو شامل کرتے ہوئے بعض اچھوتی نظمیں تخلیق کی ہیں اور ان میں کردار بھی منفرد نوعیت کے تخلیق کیے ہیں۔ ان کی نظموں میں انسانی وجود کا سوال بھی اُٹھایا گیا ہے اور معاصر فضا میں انسانی بے یقینی کے احساس کو بھی نظم کیا گیا ہے۔

ستیہ پال آنند نے اپنی معرا نظموں میں بعض اوقات یکساں بحر کے مصرعوں کو باعتبار متن نامکمل اور منتشر رکھا ہے اور اسے اگلی سطور تک بڑھنے دیا ہے۔ یوں ان کے ہاں مصرعے لگاتار ایک دوسرے میں ضم ہو کر جملوں کی سطح پر اپنے متن کو پورا کرتے ہیں۔ دراصل اسی تکنیک کے ذریعے ستیہ پال آنند نے نظم کے قاری کو اس مانوسیت سے دامن کش ہونے کی طرف مائل کیا ہے جو غزل کے ایک مصرعے کے تکملے یا ایک شعر کے دو مصرعوں سے جڑ کر مکمل ہو جانے کے احساس کی پیداوار تھی اور شہزاد نیر نے ستیہ پال کی اس تکنیک کو نہ صرف اپنی معریٰ نظموں میں برتا ہے بلکہ انہوں نے اپنی آزاد نظموں میں بھی اسے خوب نبھایا ہے۔

سلیم سہیل کہتا ہے کہ "نظم کا ہیئتی حسن اس بات میں ہے کہ آپ جو خیال اس میں لانا چاہ رہے ہیں تو تمام لفظیات اس خیال کی کمک کے لیے آئیں۔"

اس حوالے سے اگر شہزاد نیر کی نظم کا مطالعہ کیا جائے تو بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ان کے الفاظ اور موضوعات ان کی نظم کے ہیئتی حسن کو مکمل کرتے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ ہر موضوع نے اپنا سانچا یا ہیئت خود لا کر رکھ دیا ہے۔ یوں بھی شہزاد نیرؔ کو اپنے نظمیہ میدان کا استعاراتی نظام تخلیق کرنے کے لیے کسی اور دنیا کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بلکہ وہ براہ راست زندگی کے منظر نامے میں اُتر کر اس سے مکالمہ کرتا ہے۔ جو لمحے وہ جیتا ہے ان ہی کو نظم کرتا ہے اس لیے ان کی نظموں میں متحرک زندگی کے بے شمار دھڑکتے منظر اپنے قاری سے باتیں کرتے ہیں اور کہیں بھی نامانوسیت سر نہیں اُبھارتی۔ نئی نظم فی الحقیقت نئے انسان کی ذہنی، جذباتی اور لاشعوری زندگی کا علامتی انداز میں شخصی (موضوعی) اظہار ہے جبکہ پرانی یا قدیم نظم پرانے انسان کی تخلیقی فکری اور اجتماعی زندگی کا موزونیت کے ساتھ غیر شخصی (معروضی) اظہار تھا لیکن اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو شہزاد نیر نے اپنی نظموں میں نہ صرف پرانے انداز کا عکس پیش کیا ہے بلکہ نئی نظم میں تو گویا انہوں نے اپنے فن کا لوہا منوایا ہے۔ نئی نظم کی تخلیق میں انہوں نے چمن زارِ حیات سے جو رنگ منتخب کیے ہیں وہ ان کی خوش نظری اور خوش فکری کے آئینہ دار ہیں۔ ادب کے ایوان میں اگرچہ خوش نظری اور خوش فکری کی کمی نہیں مگر شہزاد نیر نے جدت اور جدیدیت کی فضا میں اسلوب، مضامین و مفاہیم، تشبیہ و استعارہ علامت اور حرف و معنی کی سطح پر اپنا انفراد برقرار رکھا ہے۔ شہزاد نیر کی مختصر نظموں میں بننے والے مناظر کبھی کبھی ان کی طویل نظموں میں پورے جاہ و

جلال اور شان وشوکت کے ساتھ نظر آتے ہیں اور انہوں نے ایک باشعور فنکار کی طرح بلیغ علامات کا استعمال کر کے اختصار کا راستہ بھی اختیار کیا ہے اور اپنی فنی دسترس کا ثبوت بھی دیا ہے۔ ان کے ہاں ایک جہانِ معنی پوشیدہ ہے اور ایک بلند آہنگ مکالمے کے بجائے ہلکی ہلکی سرگوشی ملتی ہے اور ایک دھیمے انداز سے ان دیکھے راز منکشف ہوتے نظر آتے ہیں۔

گزشتہ چند دہائیوں سے عام آدمی نے اپنے معمول کے مسائل سے کہیں بڑھ کر بعض ایسے مصائب کا بھی سامنا کیا ہے جس سے اس کی زندگی میں تلخی کے ساتھ ساتھ کرب بھی گھلا ہے۔ خصوصاً دہشت گردی کے مسلسل واقعات نے ایک عام آدمی کو عجیب بے یقینی اور نفسیاتی طور پر خوف و ہراس سے دوچار کر دیا ہے۔ ان حالات میں شہزاد نیر کی نظم عام آدمی کے طرزِ حیات کے کئی پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ نیز ان کا طنزیہ پیرایہ اظہار عام آدمی کے معیارِ زندگی کو بے وقعت بنانے والے عناصر کے لیے بھی آئینہ مثال ہے۔ یہاں وہ ترقی پسند روایت کے قریب ہو جاتے ہیں۔

شہزاد نیر کے پاس نظیر اکبر آبادی کی نظم سے لے کر ن، م راشد، میراجی، اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی، علامہ محمد اقبال، حالی، فیض، احمد ندیم قاسمی، مجید امجد اور کئی ایک نظمیں مثلاً ہم فراموش ہیں۔ دائرہ، منجمد خواب، چاہے جانے کی آرزو، اُفق کے پار جانے والے آنسو، کانچ کا پھول، لفظ خزانہ، شکست کس کی، درسِ اول، مونا لیزا، اک دریچہ، کھلا، گولک، ہچکولے کھاتے خواب، محبت اور دکھ، من وسلوئ، دھرتی ماں، فاصلے نہیں مٹتے، لہجہ نہ بدلنا، جاتے سے اور تیرے بعد یہ ایسی نظمیں ہیں جن کی سطح اور رف ضا ماقبل نظموں مثلاً گلی کا چراغ، کنواں، ہری بھری فصلو، بس سٹینڈ پر، پنواڑی، بن کے چڑیا، ساتھی، طلوع، فرض، شاعر، بندہ اور بڑے کا کتبہ کے آس پاس کی ہے۔

شہزاد نیر کی نظم کا یہ سفر اور اس کی لسانی تشکیلات من مرضی سے نہیں بلکہ قواعد زبان پر مبنی ہے اور اس میں صنعت اور تاثیر کے متضاد عناصر گھل مل کر ایک ہو گئے ہیں۔ یہ نظمیں قاری سے گہری بصیرت کے ساتھ پڑھے جانے کا تقاضا کرتی ہیں۔

رب ذوالجلال سے دعا ہے کہ ان کی تمام خوبیوں کی قوت اور شعری قد و قامت میں دن دوگنا رات چوگنا اضافہ فرمائے۔ آمین!!

ڈاکٹر عاصم درّانی / بہاولپور

فقط اس لیے سرِ کوہِ طور نہیں رہا
مجھے تابِ حسن پہ کچھ عبور نہیں رہا

مرے دل کی پیاس کا ربط تھا تری آنکھ سے
یہ وہ ہنس تھا جو ندی سے دور نہیں رہا

انہیں حکم پر بھی صبا مثال نہیں کہا
کہ جن آندھیوں میں شجر پہ بور نہیں رہا

ملیں نسلِ نو کو وہ روشنی بھری ظلمتیں
کہ سیہ سفید کا کچھ شعور نہیں رہا

وہ غلط ثبوت دیے گئے مرے جرم کے
میں خود اپنی نظروں میں بے قصور نہیں رہا

ہوس اور حرص کی گرد اُڑی تھی گلی گلی
مرے شہر میں کسی رُخ پہ نور نہیں رہا

یہی لفظ طرزِ خلوص ہے تجھے علم ہے
تو مجھے بلانے میں کہہ "ضرور" نہیں رہا

بہ یاد: سید قاسم محمود
Monthly Book Digest
بک ڈائجسٹ لاہور
ISSN 2079-4584
bookdigest@hotmail.com
kitabvirsa@gmail.com
مدیر اعلا: مظہر سلیم مجوکہ
مدیر اعزازی: اظہر سلیم مجوکہ
صوبہ پنجاب کے تمام کالجوں اور پبلک لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

فروغِ ادب کے لیے وقف
براہِ کرم اپنی اردو اور انگریزی تخلیقات (شاعری ونثر) کمپوز کروا کے "ان پیج" میں ای میل کر دیا کریں
bookdigest@hotmail.com
آپ اپنے مضامین بذریعہ ڈاک بھی ارسال کر سکتے ہیں۔ رسالے کے حصول کے لیے سالانہ زرِ تعاون مبلغ -/1000 روپے اپنے ڈاک کے پتے اور موبائل نمبر کے ساتھ بذریعہ منی آرڈر بنام مظہر سلیم مجوکہ مدیر اعلیٰ ماہنامہ بک ڈائجسٹ، کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور کو ارسال کریں۔ رسالہ آپ کو باقاعدگی سے ملتا رہے گا۔
برائے خط کتابت / ترسیل زر / رابطہ
بک ڈائجسٹ
کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
0333-4377794 - 042-37322996

"نور کا جلوہ" اور اعظم سہیل ہارون

ریاض ندیم نیازی/سبی

جوغزل گوشاعر غزل ونظم کے ساتھ ساتھ حمد ونعت بھی لکھ رہے ہیں ان کے کردار وعمل سے راسخ العقیدگی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ تصورِ توحید اور تصورِ رسالت ونبوت کا اقرار زبان سے بھی کر رہے ہیں اور عملی طور پر اس کا اظہار اشعار کی صورت میں بھی کر رہے ہیں۔ حمد ونعت گوشاعر پاکیزہ فضا میں سانس لے رہا ہے کیوں کہ حمد ونعت لکھنے کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر اور حضور اکرم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کا خیال ذہن ودل ودماغ میں جما کر ہی حمدیہ ونعتیہ اشعار کہے جاسکتے ہیں۔ ہر نعت گوشاعر کی والہانہ عقیدت کا اظہار اس کی شاعری میں کسی نہ کسی صورت میں نظر آتا ہے۔ اس کے پختہ ایمان اور مضبوط ایقان کی دلیل ہے کہ وہ ذاتِ باری تعالیٰ اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کی صفاتِ عالیہ اور اوصافِ حمیدہ کے اظہار کی راہ پر گامزن ہے۔

ایسے ہی شعرائے کرام میں حاصل پور کے رہنے والے شاعر جناب اعظم سہیل ہارون کا شمار بھی ہوتا ہے جن کا پہلا مجموعہ غزل "ایک دریا ہے میری آنکھوں میں" شائع ہوا اور بعد ازاں نعتیہ کلام "نور کا جلوہ" زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔ ان کی نعتیہ شاعری میں جذبات کی شدت نظر آتی ہے مگر ان کا انداز ہر شعر میں بڑا مؤدب ومہذب رہتا ہے۔ یہی خوبی ان کی نعت نگاری کو بڑھاوا دیتی ہے اور ان کو دیگر نعت گو شعراء سے ممتاز کرتی ہے کیوں کہ عام شعرا جو نعت کہہ رہے ہیں وہ سرسری انداز کی ہوتی ہے ان میں سنجیدگی نظر نہیں آتی، مگر اعظم سہیل ہارون کی نعتوں میں عقیدت بھی ہے اور محبت بھی۔

کہتے ہیں جس سے محبت وعقیدت ہوتی ہے اس کے ہر عمل اور ہر حکم سے روح بندھی ہوتی ہے یہی نہیں بلکہ اس سے جو چیز بھی نسب وتعلق رکھتی ہے اس سے عقیدت ہونا فطری عمل ہے۔ یہ بات انسان کی تعینات میں بھی شامل ہے۔ اعظم سہیل ہارون نے بھی حضور اکرم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ آلہ وسلم سے اپنی ذات، اولاد، ماں باپ اور مال ومنال سے زیادہ شدید محبت کی ہے۔ شہرِ مدینہ کی نسبت حضور نبی آخر صلی اللہ علیہ آلہ وسلم سے ہے اس لیے انہوں نے شہرِ مدینہ کو بھی اپنی نعتوں میں بڑی مقدس فضا میں منظوم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نعت کا ہر شعر ایک خاص جذبے اور مفہوم کے اعتبار سے دل کی دھڑکن بن جانے کی خوبی سے متصف ہے۔

اعظم سہیل ہارون نے حضور اکرم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کی تعریف وتوصیف اور مدحت اس انداز میں کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کے معجزات وواقعات اور غزوات کو بیان کیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کی عبادات، انسانوں سے روابط، زندگی کے نشیب وفراز اور مشکل وقت میں ہمت نہ ہارنے کا درس حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کی زندگی سے دیا ہے۔ ان کی تمام نعتیہ شاعری حضور ختمی المرتبت صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے گرد گھوم رہی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوبِ بیان میں شعریت اور سادگی کا حسن سمٹ آیا ہے اور ان کے ہر مصرعے میں معنی ومفہوم کی مقناطیسیت پیدا ہوگئی ہے جو ہر قاری کی توجہ اپنی جانب کھینچ رہی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر انسان کی زندگی میں قلبی طور پر جو سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے اور جس سے سب سے زیادہ دلی لگاؤ ہو جاتا ہے اس سے دل کا حال بیان کیا جاتا ہے اور اور اسی کو اپنا ہم راز بنایا جاتا ہے۔ اپنے غم وآلام، رنج والم، دکھ درد اور پریشانیوں کے بارے میں بتا کر دل کا بوجھ ہلکا کیا جاتا ہے۔ یہ ایک تعیناتی علاج بھی ہے۔ اعظم سہیل ہارون کی نعتیہ شاعری پڑھنے کے بعد یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کے ایمان واایقان کے اعتبار سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ آلہ وسلم سے زیادہ کوئی ان کے قریب نہیں، ان کا دلی لگاؤ سب سے زیادہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ آلہ وسلم سے ہے۔ عقیدۂ نبوت کا مفہوم بھی یہی ہے کہ ہر انسان کو اپنی ذات، مال واولاد اور ماں باپ سے زیادہ عزیز اور پیارے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم ہوں۔ اس بات کا واضح

ثبوت اعظم سہیل ہارون کی نعتوں میں ملتا ہے کہ انہوں نے کس طرح حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کی محبت میں زندگی بسر کی ہے اور وہ کس طرح زندگی جی رہے ہیں۔

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم سے محبت کرنا اور ان کی اطاعت کرنا، دراصل اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی اطاعت کرنا ہے۔ یہ باتیں بھی اعظم سہیل ہارون نے اپنی نعتیہ شاعری میں منظوم کی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اعظم سہیل ہارون نے دنیاوی کتابوں کے ساتھ ساتھ احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ آلہ وسلم، قرآن مجید فرقان حمید اور دیگر اسلامی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا ہے، اسی سبب سے ان کی نعتیہ شاعری میں وہ باتیں نہیں آئیں جو کم علم اور کم مایہ شاعر کرتے ہیں۔

آخر میں اپنے بھائی ممتاز شاعر و ادیب محمد امین ساجد سعیدی کا بھی بے حد ممنون ہوں کہ جن کے توسط سے محترم اعظم سہیل ہارون کا نعتیہ مجموعہ مجھ تک پہنچا۔ اعظم سہیل ہارون کی شاعری پاکیزہ محبت اور والہانہ عقیدت کا اظہار ہے۔ دُعاگو ہوں کہ اللہ رب العزت اِن کے اِس کارِ خیر کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور ان کے لیے مزید توفیقات ارزاں کرے۔ آمین چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مدینے میں بہاروں کا سماں ہر وقت رہتا ہے
وہاں جو نور ہوتا ہے فضاؤں میں اترتا ہے

....

اُن ﷺ کی نعتوں کا مرے لب سے حوالہ نہیں جاتا
اطراف مرے نور کا ہالہ نہیں جاتا

....

نعت سرکار جو سناتے ہیں
گویا جنت میں گھر بناتے ہیں

....

لطف و کرم کی اور عطاؤں کی دھوم ہے
دربارِ مصطفےٰ ﷺ پہ گداؤں کی دھوم ہے

FA, BA, BSc, MA, PCS,
CSS, PPS Books سکول بکس

کالج بک ڈپو

اُردو بازار، لاہور

سکول و کالج کی کتب کا مرکز، لائبریری بکس

042-37357567/0300-4291823

بُک ہوم کی شاہکار کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت	کتاب	مصنف	قیمت
مثالی ریاست	ارسطو/امجد محمود	1200/-	پاکستان کی سیر گاہیں	شیخ نوید اسلم	1000/-
گمبھر ہونے تک (آپ بیتی)	ہیلم ایکس/عمران الحق چوہان	1000/-	تاریخ ہند	ای-مارسڈن	800/-
سفرنامہ امریکہ	میکسم گورکی/خورشید جاوید	400/-	داس کیپیٹل	کارل مارکس/سید محمد تقی	1000/-
وادیٔ سندھ اور تہذیبیں	سر مورٹیمر وھیلر/زبیر رضوی	500/-	خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز	فریڈرک اینگلز	600/-
پنجاب اور بیرونی حملہ آور	پروفیسر عزیز الدین احمد	600/-	معاہدۂ عمرانی	ژاں ژاک روسو/ڈاکٹر محمود حسین	400/-
سقراط (حیات، فلسفہ اور نظریات)	ملک اشفاق	300/-	بڑی سوچ بڑی کامیابی	ڈاکٹر ڈیوڈ جوزف شیوارٹز	600/-
افلاطون (حیات، فلسفہ اور نظریات)	ملک اشفاق	400/-	جیسے خیالات ویسی زندگی	برائن ٹریسی/ملک اشفاق	600/-
ارسطو (حیات، فلسفہ اور نظریات)	ملک اشفاق	400/-	مسلم فلسفے کا تاریخی ارتقاء	ظفر سپل	400/-
بقراط (حیات، فلسفہ اور نظریات)	ملک اشفاق	300/-	ورثۂ دانش یونان	ظفر سپل	300/-
ابنِ خلدون (حیات، فلسفہ اور نظریات)	ملک اشفاق	600/-	تضحیک اللغات	زاہد مسعود	400/-
ابنِ رشد (حیات، فلسفہ اور نظریات)	ملک اشفاق	400/-	تنقیدی نظریات	کرامت بخاری	500/-
ابنِ سینا (حیات، فلسفہ اور نظریات)	ملک اشفاق	600/-	پاگل خانہ (افسانے)	نیر اقبال علوی	600/-
ایڈیسن (عظیم موجد کی داستان زندگی)	جی گلینو ڈکلارک	400/-	قلعہ (ناول)	فرانز کافکا/طارق عزیز سندھو	700/-
آئن سٹائن (داستان زندگی)	سید شہاب الدین دسنوی	400/-	چڑیوں کی الف لیلہ	کرشن چندر	500/-
سوشلسٹ روایت موسیٰ سے لینن تک	الیگزینڈر گرے	1800/-	کاندید	والٹیئر/سید سجاد ظہیر	500/-
مسلم لیگ اور تحریک پاکستان	پروفیسر ڈاکٹر ایم اے صوفی	1600/-	فاؤسٹ	گوئٹے/ڈاکٹر سید عابد حسین	600/-
پاکستان کے آثار قدیمہ	شیخ نوید اسلم	1200/-	ماورائے خیر و شر	فریڈرک نطشے	800/-
			اساس (Roots) (ناول)	ایلکس ہیلی	

نستعلیق مطبوعات کی کتابیں
بُک ہوم سے دستیاب ہے

بُک ہوم
بک سٹریٹ 46- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان
فون: 042-37231518-37245072
bookhome1@hotmail.com - bookhome_1@yahoo.com
www.bookhomepublishers.com
www.facebook/bookhomelahore

تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

حسن عباسی

جشن توقیر ڈاکٹر شاداب احسانی وکل پاکستان مشاعرہ

پہچان انٹرنیشنل کا یادگار مشاعرہ

ماہنامہ ''تخلیق'' کی گولڈن جوبلی سالگرہ کی تقریب

نفسا نفسی کے موجودہ دور میں عدیم الفرصتی کا یہ عالم ہے کہ خود سے بھی ملاقات نہیں ہوتی۔ ایسے میں اب کسی تقریب میں جانا یا تقریب منعقد کرنا کارِ محال دکھائی دیتا ہے۔ مگر زندگی کے ہر شعبے میں ایسے دیوانے اب بھی موجود ہیں جو اپنے ذوق کو پروان چڑھانے کے لیے تمام ضروریات کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آئے روز تقاریب منعقد ہوتی ہیں اور ان میں لوگ شرکت کرتے ہیں۔ تلاوتِ قرآن کی پرنور محفل ہو یا محفل نعت، محفل مشاعرہ ہو یا کسی کتاب کی تقریب رونمائی۔ مصوری کے فن پاروں کی نمائش ہو یا محفل موسیقی آئے روز یہ محافل سجتی ہیں اور ان میں شرکت کر کے ایک انجانی سی خوشی ہوتی ہے کہ مادہ پرستی کے زمانے میں جہاں ہر چیز کا معیار صرف پیسہ بنتا جا رہا ہے ایسے افراد کی بھی کمی نہیں جو علم و ادب اور فنونِ لطیفہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کیے ہوئے ہیں۔

آج سے چند ماہ قبل مجھے ایک فون کال آئی ''اسلام علیکم میں کراچی سے کشور عدیل جعفری بول رہا ہوں۔ کیا آپ حسن عباسی ہیں؟

میں نے جواباً وعلیکم السلام کہا اور اپنے ہونے کی تصدیق کر دی۔

''کیا آپ کو کراچی مشاعرہ میں مدعو کریں تو آپ تشریف لائیں گے؟ کشور عدیل جعفری نے پوچھا۔

مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس اچانک سوال کا کیا جواب دوں۔ کراچی سے میری بہت گہری دلی وابستگی ہے اس لیے جب وہاں سے کوئی بلائے تو مجھ سے انکار نہیں ہوتا۔ سو میں نے بے ساختہ ''ہاں'' کہہ دیا اور دوسری طرف سے شکریہ کی آواز کے ساتھ فون بند ہو گیا۔ چند ماہ گزر گئے مجھے تو یاد بھی نہیں تھا کہ ایک روز پھر فون پر وہی آواز سنی۔ محبت میں گندھی ہوئی تکریم میں اضافہ کرتی ہوئی۔ لہٰذا ''جشن توقیر ڈاکٹر شاداب احسانی وکل پاکستان محفل مشاعرہ'' میں شرکت کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔ ڈاکٹر شاداب احسانی پروفیسر ہیں اور کشور عدیل جعفری کے اُستاد ہیں۔ ان کے اعزاز میں کراچی کے اسکاؤٹ آڈیٹوریم میں اس شاندار تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ یہ دو روزہ تقریب تہذیب انٹرنیشنل کے زیر اہتمام منعقد ہوئی جس سے پاکستان بھر سے نامور شاعروں ادیبوں کو بلایا گیا تھا۔ پہلے روز کی تقریب کے دو حصے تھے۔ پہلا حصہ ڈاکٹر شاداب احسانی کے اعزاز میں تھا۔ صدارت ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، مہمانانِ خصوصی پروفیسر سحر انصاری، حسن عباس رضا (اسلام آباد) تھے۔ اظہارِ خیال کرنے والوں میں حسین مجروح (لاہور)، ڈاکٹر فہیم شناس کاظمی، ذکیہ رانی، غلام محی الدین و دیگر تھے منظوم خراجِ تحسین اختر سعیدی نے پیش کیا۔ مشاعرے میں مہمان شعراء میں میرے علاوہ۔ حسن عباس رضا، حسین مجروح، ڈاکٹر عتیق جیلانی (حیدر آباد)، محسن شکیل (کوئٹہ)، عرفی جون (سبی) اور عمیر نجمی (رحیم یار خان) تھے۔ کراچی کے شعراء میں صفدر صدیق رضی، عقیل عباس جعفری، وضاحت نسیم، اختر سعیدی، ریحانہ روحی، فہیم شناس کاظمی، نثار احمد نثار، آئرین فرحت اور دیگر شعراء شامل تھے۔ مشاعرہ بہت کامیاب رہا۔ سامعین بہت باذوق تھے۔ ہر شعر پر دل کھول کر داد دی۔ کشور عدیل جعفری نہ صرف اچھے انسان اچھے شاعر بلکہ بہت اچھے منتظم بھی ہیں۔ ہمدمِ دیرینہ علی یاسر، حسن عباس رضا کے ساتھ خوب وقت گزارا۔ لاہور میں ایک پروگرام میں شرکت کرنا تھی اس لیے دوسرے روز والے مشاعرے اور پروگرام میں شرکت نہ کر سکا اور کشور عدیل جعفری کی محبتیں سمیٹ کر لوٹ آیا۔

پہچان انٹرنیشنل کا یادگار مشاعرہ:

پہچان انٹرنیشنل کے پلیٹ فارم سے گاہے بہ

گاہے میں ادبی تقاریب کا انعقاد کرتا رہتا ہوں اور اب تک سو سے زائد تقریبات منعقد ہو چکی ہیں۔ اس میں مجھے پہچان کی جنرل سیکرٹری محترمہ لبنیٰ صفدر کی معاونت حاصل رہتی ہے۔ ان تقریبات میں بیشتر بیرونِ ملک سے آئے ہوئے میرے دوستوں اور مہمان شعراء کے اعزاز میں ہوتی ہیں۔ میں اکثر بیرونِ ملک مشاعروں میں شریک ہوتا ہوں۔ جس محبت سے وہاں کے دوست بلاتے اور جتنی پذیرائی کرتے ہیں اُسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ دیارِ غیر جہاں خونی رشتے بھی مصروف ترین زندگی میں اپنے پیاروں کو وقت نہیں دے پاتے یہ دوست شعراء اپنی تمام تر مصروفیات ترک کر کے ایئرپورٹ کے باہر ہاتھوں میں پھول لیے موجود ہوتے ہیں نہ صرف ہمارے اعزاز میں تقاریب منعقد کرتے ہیں۔ بلکہ مہمان نوازی میں بھی کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے۔ سیر و سیاحت کے لیے بھی ان کا ذوق و شوق دیدنی ہوتا ہے۔ ان کا بس چلے تو چند دنوں میں اپنے مہمانوں کو پورا ملک وہاں کی تہذیب اور کلچر اور تمام خوب صورت مقام دکھا دیں۔ اُس کے برعکس جب وہ یہاں آتے ہیں تو ہم اپنے ملک میں ان کی اُس طرح پذیرائی نہیں کر پاتے۔ بلکہ کچھ شعراء ایسی تقاریب کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور ایسا صرف وہ شعراء کرتے ہیں جن کو بیرونِ ملک مدعو نہیں کیا جاتا۔ اگر کسی جگہ وہ مدعو ہوں تو پھر سب درست ہو جاتا ہے۔ اس بار بھی پہچان انٹرنیشنل کا مشاعرہ ڈنمارک میں مقیم خوب صورت شاعر اور بہترین دوست عدیل احمد آسی کے اعزاز میں منعقد ہوا۔ ڈنمارک سے ہی ہمارے بہت پیارے دوست اور منفرد لہجے کے خوبصورت شاعر طاہر عدیل مہمانِ اعزاز تھے فرانس سے خوب صورت لب و لہجے کے شاعر اور عزیز دوست ایاز محمود ایاز بھی مہمانِ اعزاز تھے۔ صدارت ملک کے نامور شاعر جناب امجد اسلام امجد نے کی جو ہمیشہ مجھے اپنی محبت سے نوازتے ہیں۔ مہمانانِ خصوصی ڈاکٹر صغرا صدف اور وصی شاہ تھے۔ ڈاکٹر صغرا صدف کی طرف سے تو خیر ہمیشہ میری پذیرائی ہوتی ہے اور وہ میرے تمام پروگرامز میں مصروفیت کے باوجود ضرور تشریف لاتی ہیں۔ مگر اس بار کمال ہمدمِ دیرینہ اور انتہائی مقبول شاعر وصی شاہ نے کیا اور بہت مصروفیت کے باوجود میرے کہنے پر تشریف لائے۔ اس طرح مشاعرہ کا اسٹیج سج گیا۔ مشاعرے کو مزید خوب صورت لاہور اور بیرونِ لاہور سے تشریف لائے شعراء نے بنا دیا جن میں آصف نیاز، اعظم سہیل ہارون (حاصل پور)، نبیل نجم، احمد سبحانی آکاش، آستاتھ کنول، کنور امتیاز احمد، شہباز نیّر (رحیم یار خاں)، عدنان خالد، اعجاز ثاقب، آفتاب جاوید، افضل عاجز، نیازت علی نیاز، عظیم اقبال، اعجاز توکل (فیصل آباد)، گلوکار کالے خاں اور ریحان قریشی شامل ہیں۔ تمام شعراء نے بہت منفرد اور خوب صورت شاعری سنائی جس کی مہک مدتوں ساعتوں میں گونجتی رہے گی۔ نظامت کے فرائض لبنیٰ صفدر نے بہت احسن طریقے سے نبھائے۔ میں اس فرض میں ان کے ساتھ شریک رہا۔

ماہنامہ تخلیق کی گولڈن جوبلی سالگرہ کی تقریب:

ماہنامہ ''تخلیق'' سے میرا قلبی تعلق ہے۔ وہ اس لیے کہ میری پہلی غزل تخلیق میں شائع ہوئی تھی۔ جناب اظہر جاوید کی زندگی میں ان سے عقیدت و محبت کا تعلق رہا اور میرا کلام بھی شائع ہوتا رہا۔ اُن کی وفات کے بعد اُن کے نہایت لائق فرزند سونان اظہر نے جس طرح ''تخلیق'' کی شان و شوکت میں اضافہ کیا ہے اور اپنے والد کے دوستوں کو یاد رکھا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ماہنامہ تخلیق کی اشاعت کی گولڈن جوبلی سالگرہ کے موقع پر ان کی دعوت پر میں نے اور لبنیٰ صفدر نے اس تقریب میں شرکت کی۔ اس سے پہلے انہوں نے اپنی تقریبات میں کئی بار مجھے بلایا مگر بیرونِ ملک ہونے کی وجہ سے میں کسی تقریب شریک نہ ہو پایا۔ کافی عرصہ سے میری بھی خواہش تھی کہ ان کی کسی تقریب میں شرکت کروں۔ اگر میں اس تقریب میں بھی شریک نہ ہو پاتا تو یقیناً ایک اچھی اور یادگار تقریب میں شریک ہونے سے محروم رہ جاتا۔

وہاں پہنچے تو سٹیج پر ڈاکٹر خواجہ ذکریا، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، امجد اسلام امجد، غلام حسین ساجد، سرفراز سیّد اور عباس تابش موجود تھے۔ سرفراز سیّد کو تخلیق ایوارڈ پیش کیا گیا۔ تقریب نہایت منظم اور شاندار تھی۔ نامور ادیبوں کی شرکت نے اسے اور بھی شاندار بنا دیا۔ سونان اظہر نے منتخب ادیبوں کو منتخب ادیبوں سے پھول اور اعزازی شیلڈز دلوائیں۔ جن میں خاکسار کو بھی یاد رکھا۔ اس تقریب میں جن ادیبوں سے ملاقات ہوئی ان میں بشریٰ رحمٰن، ڈاکٹر خواجہ ذکریا، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، امجد اسلام امجد، غلام حسین ساجد، سرفراز سیّد، عباس تابش، ڈاکٹر اختر شمار، سعود عثمانی، نیلم احمد بشیر، بشریٰ اعجاز، سیما پیروز، عطیہ سیّد، مظہر مجوکہ، شاہد علی خاں، عمرانہ مشتاق، نواز کھرل، ناصر بشیر تھے۔ سونان اظہر کو میں اس شاندار تقریب کے انعقاد پر مبارک پیش کرتا ہوں۔

ممتاز شاعرہ، کالم نگار، روزنامہ صدائے لاہور کی ایڈیٹر
ناز بٹ کے شعری مجموعہ "وارفتگی" کی تقریب رونمائی

لاہور رائٹرز کلب کے زیر اہتمام ممتاز شاعرہ، کالم نگار اور روزنامہ صدائے لاہور کی ایڈیٹر ناز بٹ کے شعری مجموعے "وارفتگی" کی تقریب رونمائی سولہ دسمبر 2018 کو ہالیڈے ان ہوٹل لاہور میں منعقد ہوئی۔

یہ اپنی طرز کی واحد ادبی تقریب تھی جس میں نامور ادباء شعرا، سینئر صحافیوں، مقننہ، علمی، سماجی، سیاسی اور میڈیا سے تعلق رکھنے والی نہایت اہم اور نمایاں شخصیات کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

اس شاندار اور پروقار تقریب کی صدارت امجد اسلام امجد نے کی جبکہ گورنر پنجاب چوہدری محمد سرور بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے

اسٹیج پر گورنر پنجاب چوہدری محمد سرور، جناب امجد اسلام امجد، جسٹس علی اکبر قریشی، گلزار احمد بٹ، ڈاکٹر آصف محمود جاہ، سجاد میر، خالد شریف، عباس تابش، ناز بٹ، قمر رضا شہزاد، یاسمین حمید اور اسلم ڈوگر تشریف فرما تھے

گورنر پنجاب نے ناز بٹ کو ان کے شعری مجموعے وارفتگی کی مبارکباد پیش کی اور کتاب میں سے ان کے اشعار بھی سنائے۔ گورنر پنجاب نے کہا کہ آج اتنی نمایاں شخصیات جو ناز بٹ کی محبت میں اکٹھی ہوئی ہیں میں نے کم ہی اس طرح کہیں اکٹھی دیکھی ہیں۔ اور اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ میں فن و ادب سے وابستہ ان بہت ساری شخصیات میں خود کو گورنر کم اور شاعر زیادہ محسوس کر رہا ہوں۔

گورنر صاحب نے ناز بٹ کی شاعری کو سراہا اور کہا کہ "ناز بٹ شاعرانہ راز و نیاز سے بخوبی آگاہ ہیں کچھ لوگوں کا کلام ان کے چہروں پہ عیاں ہوتا ہے اور کچھ لوگوں کا چہرہ ان کے کلام میں ڈھلا ہوا ہوتا ہے،

چوہدری محمد سرور اور مجیب الرحمن شامی کے درمیان خوشگوار نوک جھونک نے خاصا لطف دیا، مجیب الرحمن شامی کے اسٹیج پر نہ آنے پر گورنر صاحب نے کہا " مجیب الرحمن شامی اسٹیج پر نہیں آ رہے آپ لوگ یہ جان لیں کہ بڑھاپے میں سیڑھیاں چڑھنا مشکل ہو جاتا ہے " جس پر شامی صاحب نے کہا "اس بات کا تو آپ کو بہتر پتہ ہوگا، سیڑھیاں اگر گورنر ہاؤس کی نہ ہوں تو " اس برجستہ جواب پر ہال میں قہقہے گونجنے لگے

صدر محفل جناب امجد اسلام امجد نے ناز بٹ کو کتاب کی مبارکباد دی، اور کہا کہ "ناز بٹ نا صرف کافی عرصے سے ادبی حلقوں میں سرگرمی سے حصہ لیتی آئی ہیں بلکہ ان کی بعض نظموں نے بھی بہت دھوم مچائی "، امجد اسلام امجد نے ناز بٹ کی شاعری کو سراہتے ہوئے وارفتگی پر اپنا مضمون پڑھتے ہوئے کہا کہ " محبت ناز کی شاعری کا بنیادی استعارہ ہے اس حوالے سے اس نے غزل میں بھی بہت اچھے اور خوبصورت اشعار نکالے ہیں، اس کی نظموں میں عروضی آہنگ کی روانی جذبے کی شدت کے ساتھ ہم آمیز ہو کر بہت لطف دیتی ہے وہ اس نغمگی سے ایسی فضا تعمیر کرتی ہے کہ قاری نظم ختم ہونے کے بعد کافی دیر تک اس کے کیف میں رہتا ہے"

محترمہ حمیدہ شاہین اور محترمہ یاسمین حمید نے بھی ناز بٹ کی شاعری پر بہت خوبصورت مضامین پڑھے، محترمہ حمیدہ شاہین نے وارفتگی پر مضمون پڑھتے ہوئے کہا:

" ناز بٹ کتاب سے پہلے ادبی دنیا میں اپنی پہچان بنا چکی تھی، اس نے اپنی پہچان کا گیت مدہم سُروں میں گایا، اور اُسے فضا میں رچنے دیا، دھیمے لہجے میں گویا ہوئی کسی دستار پر ہاتھ نہ ڈالا، نہ کسی کا آنچل کھینچا، صبر اور سکون کے ساتھ وہ اُس کرسی کی تلاش میں رہی جس پر اس کا اپنا نام لکھا تھا، یہ ایسی دنیا ہے جہاں اپنی نشستیں سنبھال کر بھی لوگ دائیں بائیں کہنیاں مارنے اور اپنے سے آگے والوں پر آوازے کسنے سے باز نہیں آتے، ان کی کہنیاں چھل جاتی ہیں، ان کی آواز برہنہ ہو جاتی ہے، ناز بٹ اسی ہجوم کے درمیان بیٹھی ہے لیکن اپنے شخصی وقار اور شائستہ لہجے کے ساتھ، اپنی وارفتگی کو اپنی حدود کے اندر سنبھالے ہوئے، اپنے الفاظ کو اپنی جھولی میں سمیٹے ہوئے....."

محترمہ یاسمین حمید نے اپنے مضمون میں کہا کہ "ناز بٹ کی کتاب پڑھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی جس کا کلی تاثر اس کے خلق کرنے والے کی فطری صلاحیت کی تصدیق کرتا ہے، وارفتگی کی شاعری میں ذاتی اور باطنی واردات کا حاصل موجود ہے، بعض اوقات باطنی واردات کے بیان میں دل اور جذبہ حاوی رہتا ہے، بعض اوقات اس پر فکر کی آمیزش اسے زمینی سطح سے اوپر تنوع کی منزل میں لے جاتی ہے، نظم کے پہلے مصرع سے آخری تک خیال کو گرفت میں رکھنے اور بھرپور تاثر سے نظم کو مکمل کرنے پر ناز کو

دسترس ہے، ناز بٹ کو نظم اور غزل کے تکنیکی فرق کا پورا ادراک ہے، اس کتاب کی تخصیص وارفتگی، بے ساختگی اور روانی ہے، اس کتاب کی شاعری خواہ وہ نظم ہے یا غزل جذبے کی ہی بنیاد پر ہی تخلیق کی گئی ہے اس کتاب کا نام وارفتگی ہی ہونا چاہئے تھا"

سینئر تجزیہ کار سجاد میر، اسلم ڈوگر، سابق وزیر صدیق صدیق الفاروق، خالد شریف، ڈاکٹر نجیب احمد، عباس تابش، ضیاء حسین ضیاء، قمر رضا شہزاد، ایثار رانا، غافر شہزاد، شکیل جازب اور آصف عنایت بٹ نے ناز بٹ کی شاعری پر گفتگو کی۔

سابق وزیر صدیق الفاروق نے کہا کہ ناز بٹ کی کتاب میں موجود ناز بٹ کا مضمون "سرگوشی سے وارفتگی تک" پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، اس مضمون کو نظم کہیں تب بھی ٹھیک، نثر کہیں تب بھی ٹھیک ہے، بہت سے لکھنے والوں کے لئے سرگوشی سے وارفتگی تک مہمیز کا کام بھی دے گا اور تمثیل بھی

مقررین نے ناز بٹ کی شاعری اور شخصیت دونوں کو ہی سراہا، کہ ایک مدت سے شعر و ادب کی دنیا سے وابستہ رہنے کے باوجود ناز بٹ اپنا شعری مجموعہ اب شائع کرایا ہے، ناز بٹ نے کبھی معیار پر سمجھوتہ نہیں کیا اور وقار کے ساتھ اپنی جگہ بنائی اور کبھی بھی شہرت کے پیچھے نہیں بھاگیں، عزت وقار اور سکون کے ساتھ صرف اور صرف اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے بل بوتے اپنا مقام اور نام بنایا شاعری، نثر اور کالم نگاری تینوں اصناف میں وہ خوب کامیاب ہیں

مقتدر شخصیات میں جسٹس علی اکبر قریشی، شعیب بن عزیز، مجیب الرحمن شامی، سلمان غنی، آصف محمود جاہ، مشہود شورش، جاوید یونس، جاوید نزیر، مسز امجد اسلام امجد، غازی بابر، گلزار احمد بٹ، منصور آفاق، مظہر برلاس، سلمان عابد، سہیل راجہ، شکیل ملک، نجم ولی خان، سلمان طارق بٹ، ملک سلمان، احسن یعقوب، کلیم اسلم، حافظ شفیق الرحمن، امتیاز بخاری، امریز خان، غضنفر اعوان، سونان اظہر جبکہ نامور شعراء و ادباء میں خالد شریف، اعتبار ساجد، عطیہ سید، سلمٰی اعوان، فرحت پروین، خالد شریف، ڈاکٹر نجیب احمد، عباس تابش، ضیاء حسین ضیا، قمر رضا شہزاد، ڈاکٹر ضیاء الحسن، نجیب جمال، ڈاکٹر غافر شہزاد، شکیل جازب، تسنیم کوثر، شاہد رضا، عنبرین صلاح الدین، سجاد بلوچ، بینا گوئندی، شاہدہ شاہ، ثمینہ سید، ڈاکٹر عنبرین منیر، روما رضوی، عفت علوی، اعظم ملک، وسیم عباس، عتیق الرحمن صفی، طارق چغتائی، وقاص عزیز، فرہاد ترابی، توقیر شریفی اور بہت سے قابل ذکر احباب نے شرکت کی۔

کتاب کا نفیس سرورق وسیم عباس نے تیار کیا ہے جبکہ اس کتاب کو عمران اللہ کے ادارہ التحریر نے شائع کیا ہے، ادارہ التحریر نے ماضی میں
پروین شاکر کی خوشبو اور مستنصر حسین تارڑ کی نکلے تری تلاش میں متعارف کروائی ہیں

نظامت کے فرائض نواز کھرل نے انجام دیئے۔

بعد ازاں ناز بٹ کو پھولوں کے گلدستے بھی پیش کیے گئے ، ناز بٹ نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور کتاب میں سے کلام بھی سنایا، احباب نے ناز بٹ کے شعری مجموعے کو اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ قرار دینے کے ساتھ اس تقریب کو ادبی منظر نامے کی تاریخی اور نمائندہ تقریب قرار دیا۔ تقریب کی کوریج کے لئے الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا کی بڑی تعداد موجود تھی، ناز بٹ نے سب کا شکریہ ادا کیا

شہباز نیر/لاہور

وہ راز بس چھپا ہے درِ مرسلین میں
منصف کھڑے ہوئے ہیں جہاں سائلین میں

وہ اب مرا کہ غیر کا بنتا ہے دیکھئے
انجام فلم کا ہے اسی ایک سین میں

ورنہ رقیب ہوتا یہی فون لاکھ شکر
احساس کا جواز نہیں ہے مشین میں

اب سانپ پالنے کی ضرورت نہیں ہمیں
رہنے لگے ہیں دوست بھی کچھ آستین میں

دیجے کتھارسس کے لیے دس منٹ کا وقت
دو چار شعر کہہ لوں کسی کی زمین میں

اعلان کس نے کرنا ہے اب اپنی جیت کا
جھگڑا پڑا ہوا ہے مرے فاتحین میں

سجدے ہیں چند اور ہے انسانیت سے پیار
کچھ ایسی سختیاں بھی نہیں میرے دین میں

اب عشق میں بھی ملنے لگی ہیں سہولتیں
مقبول ہو رہا ہے یہ اب صارفین میں

ہم تو مزارِ عشق پہ بیٹھے ملنگ ہیں
اور تم سمجھ رہے ہو ہمیں زائرین میں

ہم پر نہ دل لٹائیے، لیجے نہ جاں کا رسک
عاشق نہیں ہیں، ہم ہیں فقط شائقین میں

شہباز میری ضد، مجھے خود بھی نہیں پسند
کچھ عادتیں ملی ہیں مجھے یار جین میں

پھر ہمیں قتل ہو آئیں یار

ڈاکٹر عطیہ سیّد

فون کی گھنٹی بجی۔ شہر یار نے ریسور اٹھایا:
''ہیلو!''
''ہیلو! شہر یار بھائی! ہمایوں بول رہا ہوں۔''
''اچھا۔ کیا حال ہیں؟''
''کچھ نرم گرم ہی ہیں۔''
''کیوں؟''
''آپ تو بخوبی جانتے ہیں۔''
''ہاں..... بس کرو۔ یار! توبہ کرلو۔'' شہر یار نے چھیڑ چھاڑ کے انداز میں کہا۔
''کس چیز سے؟''
''اس جنون سے کہ سچ کیا ہے۔ دن رات تم سچ کی تلاش میں رہتے ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ مخالفین کا ایک جمِ غفیر تمہارے پیچھے ہے۔''
''بھئی! میرے پیشے کا تقاضا ہے..... سچ کی تلاش۔''
''خیر سچ کیا ہے، یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ تمہیں تو محض خبر کی تلاش ہونی چاہیے۔''
''شہر یار بھائی! فلسفیانہ نقطہ نظر سے تو واقعی سچ کی تعریف مشکل ہے۔ لیکن مجھے محض تلاش ہوتی ہے خبر کے پیچھے چھپی ہوئی کہانی کی۔''
''یوں کرو میرے بھائی! کہ محض خبر دیا کرو۔''
ہمایون ہنسنے لگا: ''یہ آپ کہہ رہے ہیں! آپ تو مجھ سے دو قدم آگے ہیں اس سلسلے میں۔ تحقیق کرتے ہوئے جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ یاد کریں وہ سرکاری دفاتر پر حملے اور آپ نے جو تفتیش کی اس کے نتیجے میں اہم انکشافات، جنہوں نے آپ کے لیے بے شمار خطرات پیدا کر دیئے تھے۔''

جواب میں شہر یار بھی ہنسنے لگا۔
''اچھا شہر یار بھائی! اجازت۔ کل شام ملیں گے۔ اس وقت تو ایک کام سے جا رہا ہوں۔''
''ضرور..... ضرور، لیکن باہر نکلتے ہوئے اپنا خیال رکھنا..... محتاط رہنا۔ کراچی ایک ایسا شہر ہے جو بیک وقت ظالم بھی ہے اور مظلوم بھی۔''
''مگر میں نے کیا بگاڑا ہے کسی کا؟''
''اُف! یہ تجاہلِ عارفانہ۔ بہت سوں کا بگاڑا ہے ..... میرے یار! کراچی کے اندر پھلتی پھولتی ڈرگ مافیا، لینڈ مافیا..... اور نجانے کس کس قسم کے گروہوں اور مافیاز کو بے نقاب کر کے۔''
ہمایوں نے قہقہہ لگایا۔ اور پوچھا: ''اور کیا فردِ جرم مجھ پر عائد کی جائے گی؟''
''تم خارجی ہو..... باہر سے آ کر یہاں آباد ہوئے ہو۔''
''یہاں تو زیادہ تر لوگ باہر سے آ کر آباد ہوئے ہیں۔''
''درست۔ لیکن جو بھی باہر سے آیا، اس نے یہاں کی فضا کو بدلا اور غالباً مقامیوں کو برا بھی لگا۔''
''تو پھر کیا ہوا۔ وہ جو باہر سے آئے تھے وہ بھی وقت کے ساتھ ساتھ مقامی ہو گئے۔''
''لیکن میرے بھائی! ہوا یہ کہ پھر اور لوگ باہر سے آ گئے۔''
''یہ تو تاریخی عمل ہے۔ لحہ بہ لحہ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔''
''اب کی بار یہ عمل آسانی سے ہضم نہیں ہو رہا، کیوں کہ نظامِ انہضام کمزور حالت میں ہے۔''

''بس بھئی بس۔ چیف صاحب! باقی الزامات کل شام خود حاضر ہو کر سنوں گا۔ خدا حافظ!''
اگلی شام ہمایوں وعدے کے مطابق شہر یار کے گھر آیا اور ساتھ میں اس کے بیوی بچوں کے لیے پیزا اور کیک بھی لایا۔
''یار! یہ کیا تکلف ہے۔'' شہر یار نے پیزا اور کیک کے ڈبوں کی طرف اشارہ کیا۔
''بھاجی! آپ لاہوری ٹھہرے، کھابے ٹھابے کے شوقین، میں بھلا خالی ہاتھ کیسے آتا۔''
''تو جگر! پھر تو مرغ مسلم اور حلیم یا نہاری، سری پایے، لاتے نا۔''
اس پر ہمایوں دل کھول کر ہنسا: ''واقعی غلطی ہو گئی۔''
''ویسے یار! میں تمہیں حقیقت بتاؤں..... میں سبزی خور ہوں۔''
''چھوڑو..... بھاجی! چھوڑو۔''
''نہیں سچ مچ۔''
''تو پھر تم کیسا مسلمان ہے؟''
شہر یار مسکرایا۔ ''بھلا مسلمانی ثابت کرنے کے لیے گوشت کھانا ضروری ہے۔''
''بالکل۔'' ہمایوں کی آنکھوں میں شرارت تھی۔
''تو پھر ڈاڑھی رکھنا بھی ضروری ہوگا۔''
''جو آپ کی ہے اس لیے طالبان سے آپ کے گہرے تعلقات بتائے جاتے ہیں۔''
''گہرے تو نہیں..... جان پہچان ہی کو یار لوگ لے اڑے۔''
''بہر حال اسامہ کا پہلا یا شاید دوسرا انٹرویو آپ

ہی سے منسوب ہے۔"

پھر شہریار نے موضوع بدلتے ہوئے کہا: "پس ثابت ہوا کہ مسلمان ہونے کے لیے ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔"

اتنے میں شہریار کی بیوی چائے لے آئی۔ دونوں صحافی چائے سے لطف اندوز ہونے لگے جس کے دوران ہمایوں نے مسز شہریار سے رسمی ہلکی پھلکی باتیں کیں۔

جب بیوی چلی گئی تو شہریار ہمایوں سے مخاطب ہوا۔

"ہمایوں! تم بہت پڑھتے بھی ہو...... ظاہر ہے سوچتے بھی ہو۔ صحافت ایک قسم کا تحقیقی کام بن چکی ہے۔ ذرا یہ تو سمجھاؤ کہ اچانک ایک صاحب جو کبھی سوویت یونین نہیں گئے...... نہ موجودہ روس میں رہے ہیں، محض ایک مہینے کے ویزا پر ماسکو گئے اور آ کر ایک تنخواہ دار ملازم اور انٹرنیٹ کی مدد سے...... کیوں کہ انہیں انگریزی نہیں آتی، سوویت یونین کے زوال پر اتنی بڑی یعنی موٹی کتاب کیسے لکھ لی اور بقول ان کے روسی سفارت کار انہیں اس کا انگریزی ترجمہ کسی انگریز دان سے کروانے کا کہہ رہے ہیں۔ یہ کیا ماجرا ہے! سر پیر سمجھ نہیں آ رہا ہے۔"

ہمایوں سوچنے لگا۔ "ہاں یار! تک تو نہیں بنتی۔"

"یہی میں محسوس کر رہا ہوں...... کئی سوال دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں ...... مثلاً سوویت یونین کے عہدِ زوال ہی کو کیوں چنا گیا؟ ان کے عروج اور اس سے پہلے جدوجہد کی سنہری داستان کو کیوں نظر انداز کیا گیا؟"

ہمایوں نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا: "درست۔ یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ چیچنیا کی آزادی کی اتنی حمایت؟ اگر یہ ان کے مسلمان ہونے کے ناتے تھی تو ہمارے لیے تو کشمیر اور فلسطین کی آزادی زیادہ اہم ہے اور طویل تر بھی۔"

"یقیناً۔ ہمایوں! مجھے تو اس پر بھی حیرت ہے کہ چیچن لڑاکوں کو "جیالے" کا خطاب دیا گیا جب کہ بش کے نیو ورلڈ آرڈر کے حوالے اور ان کی اصطلاحوں کے تحت وہ "دہشت گرد" کے زمرے میں آتے ہیں۔ کیوں کہ 'دہشت گردی' کی اس وقت مستعمل اصطلاح کے مطابق دہشت گرد وہ ہے جو نہتے پرامن شہریوں پر حملہ آور ہو۔"

ہمایوں کی آنکھوں میں غور و فکر دکھائی دینے لگا اور آنکھوں کے نیچے حساسیت کے سیاہ حلقے نمایاں ہونے لگے۔

"شہریار بھائی! آپ کی بات سو فیصد درست ہے، کیوں کہ خود "بی بی سی" پر چلنے والی ایک ڈاکومینٹری میں چیچن سفاکی بلکہ سفاکیوں کی جو تصویر کشی کی گئی ہے اسے کیسے بھلایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ماسکو کے ایک تھیٹر میں چیچن کارروائی کو ہیرو ازم قرار دینا اور ایک سکول میں کم عمر ننھے منے بچوں کو یرغمال بنانے کے بارے میں مکمل خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ حالانکہ اس کی فل ٹائم کوریج دنیا بھر میں دیکھی گئی۔ اس کے علاوہ ان میں سے کئی ایک القاعدہ کے بھی رکن ہیں۔"

"چیچن تیل کے ذخائر پر روس کے قبضے کی مخالفت کرنا اور یہ بھلا دینا کہ خود مغرب کی ان پر نظر ہے اور اسی بنا پر چیچن تحریک کو یورپ وغیرہ کی پشت پناہی حاصل ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف یا تو بے خبر ہے یا دانستہ اس امر کی جانب توجہ نہیں دے رہا کہ امریکہ اور یورپ کی نگاہیں دنیا بھر کے وسائل پر عموماً اور ان علاقوں پر خصوصاً جمی ہیں جو پہلے سوویت یونین کا حصہ تھے۔"

"ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے؟" ہمایوں نے کہا: "پوٹن (Putin) پر بعض الزامات لگائے گئے جن میں قتل جیسے جرم بھی شامل ہیں...... اور یہ کہنا کہ سوویت یونین کے عہد میں اضافہ ہوا، اس لیے غیر منطقی ہے کہ امریکہ میں بھی ذہنی مریضوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوا اور ہو رہا ہے۔ یہ وہی کہانیاں ہیں جو مغربی میڈیا میں گھما پھرا کے پیش کی جاتی ہیں...... اور کون نہیں جانتا کہ مغربی میڈیا خصوصاً امریکن میڈیا نہ تو آزاد ہے اور نہ غیر جانبدار۔ ان کی آزادیِ اظہار محض شعبدہ بازی ہے۔"

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔" شہریار بولا: "لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ لکھاری بغیر شواہد کے بلا واسطہ طور پر پوٹن کی ذات کو نشانہ بنا رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ روسی سفارت کار اس کی کتاب کا انگریزی میں ترجمے کی فرمائش کر رہے ہیں اور شاید فنڈنگ بھی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ پوٹن کی حکومت خود اسی کے خلاف لکھی جانے والی تحریر کے ترجمے کے لیے کہے؟"

ہمایوں نے اپنا بریف کیس اٹھایا: "چلو لالہ! اس معمے کا حل ڈھونڈتے ہیں۔ ورنہ سرد جنگ میں تو اس قسم کی باتیں مغربی ذرائع ابلاغ میں عام تھیں، مگر ہم لوگ ذرا کنارا کش ہی تھے۔"

"لیکن اب تو بچے سمجھدار ہیں۔ ہمارے گارڈ آف آنر والے صاحب جنہیں ابتدا ہی میں یہاں "گورباچوف" کا خطاب دیا جا چکا ہے...... جانے جاتے جاتے کتنے در کھول گئے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہو...... مگر جس بات پر ہم بات چیت کر رہے ہیں اس کا تعلق لمحہ موجود سے ہے۔" ہمایوں بولا۔

"میرا دھیان بھی اس سمت جاتا ہے، ورنہ اپنے

وطن میں ان گنت افراد اور صحافیوں کی شہادتوں اور گمشدگی کا موضوع چھوڑ کر اتنے دور کسی یوریشن ملک قصہء پارینہ اور خصوصاً وہاں کے صحافیوں کی موت یا گمشدگی کی کہانیاں اتنے درد بھرے انداز میں لکھنا چہ معنی دارد؟" شہریار نے ایک اور سوال اٹھایا: "اور پھر وہی پین اسلام ازم۔ جس کی خامیاں وقت نے واضح کر دی ہیں.....اور پھر چیچن! اللہ بہتر جانتا ہے لیکن مشہور ہے کہ ان میں سے اکثر سمگلر اور جرائم پیشہ ہیں۔"

"لالہ! کہیں یہ وہ چنگاریاں تو نہیں جن سے ایک اور آگ بھڑکانے کی کوشش کی جا رہی ہو یا ممکن ہے مصنف ذہنی انتشار کا شکار ہو۔"

"بس یار! حیرت میں گم ہوں۔ امید ہے اگلے چند دنوں میں ہم دونوں کسی نہ کسی نتیجے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"امید تو ہے۔"

شہریار اور ہمایوں اس بجھارت کو حل کرنے کی آرزو لیے ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔

دوسرے دن دوپہر کو ہمایوں نے شہریار کو فون کیا، لیکن پہلی بوجھ لینے کی خوشخبری کے بجائے ایک اور سوال پوچھا: "مصنف نے روس کے پنگوں کا ذکر کیا ہے یعنی کیوبا والا مسئلہ.....مگر امریکہ کے پنگوں سے چشم پوشی کرتا ہے جو ہزاروں میل دور ویت نام جیسے غریب ملک سے پچیس برس ایک ناکام جنگ لڑتا ہے اور اپنے بے شمار نوجوانوں کو موت کے سپرد کرتا ہے۔ مصنف کی بے خبری اور غیر معروضی ہونے کی انتہا ہے کہ وہ اس جدلیات ہی سے بے خبر ہے، جس سے دنیا کا توازن قائم تھا۔"

"ہاں ہمایوں! مگر میرا سوال اب بھی قائم ہے کہ اس وقت ان عام سی معلومات پر مبنی کتاب کو کس لیے لکھا گیا۔ اسے پذیرائی بھی مل رہی ہے اور ترجمہ بھی کیا جا رہا ہے.....روس میں نہیں، بلکہ انگریزی میں۔ تھنک، مائی ڈیئر واٹسن"

ہمایوں نے بھی آخری جملے کے جواب میں شرارت کے انداز کو اپناتے ہوئے جواب دیا: "او۔ کے، مسٹر شرلک ہومز۔"

شہریار نے فون کا ریسیور واپس رکھ دیا۔ نجانے کیوں اسے دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا.....عجیب قسم کا احساس جیسے اس نے کسی کو کھو دیا ہو۔

سورج چمک رہا تھا، مگر شہریار کا کمرہ نیم تاریکی میں ڈوبا تھا۔ وہ لیمپ کی روشنی میں اس وقت ایک رپورٹ تیار کر رہا تھا۔ لیکن ہمایوں سے باتوں کے بعد اس کا جی اچاٹ سا ہو گیا۔ اس نے لیمپ بجھایا اور پلنگ پر نیم دراز ہو گیا۔ اتنے میں بجلی چلی گئی۔ گرمی کافی تھی اس پر پل پل کی لوڈشیڈنگ، یو پی ایس خراب ہو چکا تھا اور اب کوئی اسے ٹھیک کرنے والا دستیاب نہ تھا۔ لہٰذا وہ برمودا شارٹس اور بنیان پہن کر ہاتھ سے پنکھا جھل رہا تھا۔

وہ کسی دور دراز نیم مغربی ملک کی حسین صحافی نہیں تھا جس سکارف، خوبصورت بلاؤز اور لانگ سکرٹ میں ملبوس ہو..... ملک کی کسی مشہور یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہو.....کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ رومان پر وہ صبحیں اور راتیں گزارتی ہو..... جو اک تارہ ہو..... زیب نظر۔ شہریار تو ایک نچلے متوسط طبقے.....تیسری دنیا کے ایک غریب ملک کا مزدور پیشہ شخص تھا جس کی شادی روایتی انداز میں ہوئی، اوپر نیچے چار بچے اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ کرنے آن پہنچے۔ اب نہ صرف روٹی، کپڑا، مکان بلکہ ان کی تعلیم کا بوجھ بھی اسکے ناتواں کندھوں پر تھا۔ اس کا مکان شہر کے ایسے علاقے میں تھا جس صحافیوں کو تین سے پانچ مرلے سستے داموں دے کر ان پر احسان کیا گیا تھا۔ لیکن سڑکیں اور سیوریج سسٹم خراب تھے۔ سو سڑکیں جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں اور سیوریج میں ہولز اُبل کر سڑکوں اور گلیوں کو بے برسات ٹھہرے ہوئے پانی کے جوہڑوں میں تبدیل کر رہے تھے۔ اس کی زندگی میں رومانویت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ شیلے، کیٹس، گوئٹے یا پشکن کی نظمیں نہیں پڑھتا تھا۔ اُسے تو فیض اور بلھے شاہ پڑھنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔

شام کو شہریار بجلی آ جانے کے بعد سو کر اٹھا اور بیوی کو کہا کہ چائے بنا کر لائے۔ بیوی کے چائے بناتے بناتے اس نے بالٹی میں جمع کیے ہوئے پانی سے غسل کیا اور شلوار قمیص، پہن کر ٹی وی لگا دیا۔ اتنے میں بیوی چائے بنا کر لے آئی۔ اس نے چائے کے مگ سے ایک چسکی لی تھی کہ "بریکنگ نیوز" کی ہولناک موسیقی نے جسم میں لرزش سی پیدا کر دی تھی۔

"یا خدا! اب کیا ہوا؟"

ٹی وی چینل نے سسپنس بڑھانے کے تمام حربے استعمال کرنے کے بعد ایک بنی سنوری دوشیزہ نیوز کاسٹر نے لمبی تمہید کے بعد اصل خبر دی:

"ہمایوں حمید.....مشہور نیوز رپورٹر کو آج دوپہر ڈھلے اپنے دفتر سے چند گز کے فاصلے پر نامعلوم حملہ آوروں نے چاروں طرف سے گھیر کر ہلاک کر دیا۔ مقامی پولیس واقعے کے بعد وہاں پہنچی اور نامعلوم حملہ آواروں کے خلاف مقدمہ درج کر لیا۔"

"ہمایوں!....." شہریار کے ہاتھ سے چائے کا مگ پھسل کر زمین پر گرا اور تڑاخ سے بے شمار کرچیوں میں تقسیم ہو گیا۔

ہمایوں.....جو چند گھنٹے پہلے اپنے ثابت وسالم وجود کے ساتھ.....اپنے گلاب چہرے، ستارہ آنکھوں اور میٹھی باتوں کے ساتھ زندہ تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا، لیکن اس کے ساتھ اسے اپنے اندر سے اٹھنے

والے وسوسوں کے سیاہ بادل بھی یاد آ رہے تھے جن کی بنا پر اس نے محسوس کیا تھا کہ جیسے ہو آخری مرتبہ ہمایوں کی میٹھی آواز سن رہا ہو۔ بہر حال اب ہمایوں کہاں؟ حملہ آور ہمیشہ معلوم ہوتے ہوئے بھی نامعلوم ہوتے ہیں...... اور نامعلوم کو کون پکڑ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمایوں کسی طاقتور ملک یا اس کے طاقتور حریف ملک سے بھی تعلق نہیں رکھتا تھا کہ اس کی درد ناک کہانی کو دیس بدیس اچھالا جائے جس سے ساری دنیا میں تہلکہ مچ جائے اور مرنے والا یا مرنے والی انتہائی رومانوی انداز میں ہیرو اور شہید صحافت و صداقت بن جائے۔ وہ کوئی زیب نظر ستارہ نہیں تھا محض ایک اندھیری گلی میں جلنے والا گیس کا سٹریٹ لیمپ تھا، کسی نے روڑا مارا اور اڑا دیا کس نے چیخنا اور کس نے پکارنا...... کیسا واویلا اور کیسی تشہیر۔ ایک عام آدمی کی موت چاہے وہ کوئی صحافی ہی کیوں نہ ہو، ایک معمولی خبر ہوا کرتی ہے۔ خصوصاً جب وہ دنیا کی کسی عظیم طاقت کے لیے کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو۔

شہریار کے لیے ہمایوں کی جواں سال موت بجلی کے جھٹکے سے کم نہ تھی۔ چند روز اس کا ذہن بکھرا رہا۔ سوچنے کی قوت شل سی ہوگئی۔ اسے کرب کی کیفیت اور اذیت کے سبب پندرہ دن بعد یاد آیا کہ اس نے صحافت کے میدان کی ایک برگزیدہ ہستی سے ملنے جانا تھا۔ سو اس نے زبردستی اپنے آپ کو کرب کے تعطل سے نکالا اور مشہور سینئر صحافی سے از سر نو ملاقات کا وقت طے کیا۔ بزرگ صحافی نے شہر کے ایک مشہور فائیو سٹار ہوٹل میں ملنے کو کہا اور وہ بھی سوئمنگ پول کے کنارے۔ سو وہ بستر سے اٹھا، شیو بنائی، نہایا اور اپنے اکلوتے تھری پیس سوٹ کو پہن کر اپنی کھٹارا مہران سوزوکی میں بیٹھ کر منزل کی طرف روانہ ہوا۔

سوئمنگ پول کا پانی شفاف اور فیروزی رنگ کا تھا اور اس کے کنارے آرام کرسیوں پر لیٹے ہوئے ملکی وغیر ملکی کسی اور سیارے کی مخلوق دکھائی دے رہے تھے۔

شہریار کو اپنی طرف آتا دیکھ کر برگزیدہ جہاں دیدہ صحافی جو شاید کسی بین الاقوامی تھنک ٹینک کا رکن بھی تھا، اپنی مکار آنکھوں میں مسکراہٹ لیے اس کے استقبال کے لیے پول کے کنارے رکھی آرام کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے پورے وجود میں امارات رچی بسی تھی، یہ الگ بات کہ جوشِ جوانی میں اس نے لاہور ریلوے سٹیشن کو بم سے اڑانے کی کوشش کی تھی جو قبل از وقت معلوم ہونے پر وہ اور اس کے ساتھی سب گرفتار ہوئے لیکن موصوف وعدہ معاف گواہ بن کر جیل کی سختیوں اور سزا کی مشقوں سے محفوظ رہے۔

''ہیلو، شہریار، ہاؤ آر یو۔''

''فائن۔ سر!''

''اینڈ ہاؤ گوز دی ورلڈ؟''

''ویل سر! وہ تو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ آپ کو جنتر منتر جو آتے ہیں۔''

گرگ بارہ دیدہ برگزیدہ صحافی نے عینک کے شیشوں کے اوپر والے حصے سے بغور شہریار کو دیکھا۔ لیکن طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے مہمان نوازی کے آداب کے مطابق پوچھا: ''کیا لو گے؟ چائے یا کچھ اور؟''

''شکریہ کچھ نہیں لوں گا۔''

''ارے یار کچھ تو لو۔ چائے نہیں تو کوئی مشروب۔''

''چھوڑیں سر! ان تکلفات کو، ویسے بھی لفظ 'مشروب' مشکوک ہے۔'' شہریار نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

''ارے یار! کیوں مذاق اڑاتے ہو ہم بڈھوں کا۔ کبھی ''مشروب'' پہ اعتراض ہے تو کبھی ''جنتر منتر'' کا طنز ہے۔ یار! ہم تو اب عمر رسیدہ ہیں...... وہ طاقت...... وہ توانائی کہاں۔ ہاں (ball) تو تمہارے کورٹ میں ہے۔''

''بڑے صاحب! آپ بھی تو ہم غریبوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ہمارے وہ ذرائع...... وہ وسائل کہاں؟'' اور قدرے توقف سے شہریار بولا: ''اور وہ ٹچ آف کلاس بھی نہیں۔''

موٹی کھال والے بھینسے کی طرح ڈھیٹ بڑی عمر کے صحافی نے طنز کے جواب میں طنز کا وار کیا: ''ہاں...... اور ٹچ آف کلاس بھی نہیں۔''

''جی۔ درست۔''

''چلو یار! یہ طنز ونز۔ آمدم برسر مطلب۔ یہ تمہارے ٹولے نے کیا کہانیاں ادھر اُدھر پھیلانے شروع کر دی ہیں۔''

''کونسی کہانیاں؟''

''یہی کہ کسی نے یہاں ''شکریہ گورباچوف'' لکھ کر سوویت یونین کے زوال پذیر اور اخلاقی طور پر کمزور معاشرے کی تصویر کشی کیوں کی اور چیچن تحریک کی حمایت کیوں کی؟''

''میرا خیال ہے کہ صحافتی تجزیے اور تحقیق کو کہانی نہیں کہا جا سکتا۔ باقی سوالات تو اٹھتے رہتے ہیں اور ہر سوچنے والے کا حق بھی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی معلومات درست نہیں جو اس کتاب کے مصنف نے حقائق کے طور پر پیش کی ہیں۔''

''لیکن میرے نزدیک تم لوگ یہ کہنے میں حق بجانب نہیں ہو کہ اس وقت یہ کتاب کیوں لکھی گئی ہے۔ یہ بیکار سوال ہے۔ جب چاہے کوئی شخص کسی موضوع پر کتاب لکھ دے۔''

"جی...... غالباً یہ بات کسی حد تک درست ہے۔ لیکن اس کتاب کے لکھنے اور شائع ہونے سے پہلے مصنف کا کسی خاص سفارت خانے میں کئی بار جانا...... جبکہ وہ محض بی۔اے پاس ہو اور ایک لوئر مڈل کلاس کے علاقے میں ایک نجی سکول چلا رہا ہو، تو تھوڑی سی حیرت ہوتی ہے۔"

"ہوتی ہے اور نہیں بھی۔ کیا معلوم وہ غریب ویزا لگوانے کے چکر میں ہو۔"

"غریب!......کون غریب؟ اس شخص نے تو اپنے سکول کی مزید دو شاخیں کھول لی ہیں اور گزشتہ دنوں پٹرول کی قیمت کے ساتھ ساتھ سکول کی فیسوں میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ تین دن والدین نے سڑکوں پر احتجاج کیا۔"

جہاں دیدہ صحافی کی آنکھیں مسکرائیں اور پھر اس نے ایک قہقہہ لگایا۔

"تو بس معمہ حل ہو گیا۔ وہ شاید اس غیر ملک میں اپنے سکول کی برانچ کھلوانا چاہتا ہوگا۔"

"یعنی، ایسے سکول کی......اور پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسے اس ملک کے ذریعہ تعلیم یا نظام تعلیم کا علم ہو سکتا ہے۔"؟

"بس یار! تم لوگ زیادہ ہی حساس ہو گئے ہو اور ہر مقام پر تمہیں سازش نظر آتی ہے۔"

"کمال ہے۔ آپ تو جوانی میں خود بھی left کی طرف خطرناک حد تک جھکاؤ رکھتے تھے۔ اب اس مصنف کی کتاب کی جو واضح طور پر مغربی پروپیگنڈے (Propaganda) کی تکرار ہے، آپ نے اپنے اخباری تبصرے میں تعریفوں کے پل باندھ دیئے ہیں۔"

سینئر صحافی نے کھسانی بلی کی طرح کھمبا نوچا۔ "بات یہ ہے میرے بھائی! رات گئی، بات گئی۔ جوانی گئی...... جوانی کی لن ترانی گئی۔ دیکھو، برخوردار! میرا تمہیں مخلصانہ، دوستانہ، برادرانہ مشورہ ہے......اور وہ یہ کہ اس معاملے پر زیادہ غور کرنا چھوڑ دو۔ غریب آدمی ہو، بیوی بچے ہیں، مشکل سے دو وقت کی روٹی کماتے ہو......اور چلے ہو جیمز "بونڈ بننے۔"

شہریار کے چہرے پر ناگواری کے آثار دکھائی دیئے۔ "آپ تو شاید ہمایوں کی موت کو بھی بھلانے کا مشورہ دیں گے...... بلکہ شاید نہیں، یقیناً...... کیوں کہ آپ کے خیالات عالیہ کے مطابق تو بہترین فلسفہ حیات Rnagmatism ہے۔ جس کا آسان ترجمہ منفعت پسندی اور موقعہ پرستی ہونا چاہیے۔ اس کا اظہار آپ بارہا اپنے ٹی وی کے پروگراموں میں کر چکے ہیں۔"

اب کے گرگ بارہ دیدہ کے دیدوں میں رنجش کی خطرناک جھلک دکھائی دی: "ہاں۔ یہ میری زندگی کے تجربے سے سیکھا ہوا سبق ہے۔ سیاست اور اخلاقیات کا آپس میں کوئی تعلق نہیں...... نہ ہو سکتا ہے۔ تم نئی نسل کے صحافی سرابوں کے جنگل میں بھٹک رہے ہو۔ میرا اب بھی تمہیں یہ مشورہ ہے "Don't chase the wild goose."

ان جملوں کے ساتھ ہی جہاں دیدہ و کامیاب صحافی نے کرسی سے اٹھ کر الوداعی انداز میں شہریار کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ گویا کہ اشارہ تھا کہ انٹرویو ختم ہوا۔

جونہی شہریار واپس جانے کے لیے مڑا تو عقب سے آواز آئی: "ویسے یہ تو بتاتے جاؤ کہ ہمایوں کس ٹوہ میں تھا اور کیا وہ کسی حد تک اس گمشدہ سرے کے قریب تھا؟"

شہریار کا جی چاہا کہ پلٹ کر پلے ہوئے "تھینک ٹینک" کے منہ پر ایک چپت رسید کرے حالانکہ عام طور پر وہ ایک دھیمے مزاج کا شخص سمجھا جاتا تھا۔ مگر اس نے اپنے جذبات پہ قابو پاتے ہوئے کہا "یہ تو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔"

کئی روز...... ہفتے...... مہینے گزر گئے، لیکن صحافی برادری کے دباؤ اور مظاہروں کے باوجود ہمایوں کے قاتل گرفتار نہ ہو سکے۔ اگرچہ شہریار کے دل میں یہ بات کانٹے کی طرح شدید چبھن پیدا کر رہی تھی لیکن شاید اسی چبھن اور کسک کی بنا پر وہ دن رات "گوربا چوف! شکریہ" کے معمے کو سلجھانے میں جتا رہا۔ اس سلسلے میں اس نے اپنی اور ہمایوں کی اکٹھی کی ہوئی معلومات کو بار بار پڑھا اور ان پر غور و فکر جاری رہا۔ یہ وہ حقائق و مشاہدات تھے جو مذکورہ کتاب کے منظر عام پر آنے سے پہلے اور مذکورہ کتاب کے مصنف کے ایک خاص ملک کے سفارت خانے میں آمد و رفت سے پہلے کی تمام بین الاقوامی اور قومی اخباروں میں لکھے جانے والے کالموں، مضامین اور خبروں پر مشتمل تھے۔ جو پیاز کے چھلکوں کی طرح تہہ در تہہ......دائرہ در دائرہ ایک دوسرے سے مربوط، لیکن بظاہر غیر مربوط تھیں۔ یوں یہ بھول بھلیوں سے کم سے کم نہ تھیں جو تاریک یا کم از کم نیم تاریک تھیں۔ مگر اس کا دل کہتا تھا کہ انہی میں کوئی روشنی کا نقطہ بھی ہے اور وہ متلاشی تھا اس روشنی کے نقطے کا جو اگر مل جائے تو اندھیرے میں راستہ مل جائے گا۔

وہ بار بار انٹرنیٹ پر ساری دنیا اور خصوصاً اپنے ملک کی اہم شخصیات کے بیانات، ملکی اور غیر ملکی مدبرین کے مضامین اور اپنے ہاں پل پل بدلتی صورتحال کے بیچ کسی ربط کی تلاش میں رہتا......اور آخر ایک دن اسے ایک غیر ملکی اخبار میں جس کے قارئین شاید زیادہ نہ تھے) تیسرے صفحے پر دو سطروں کی ایک خبر فلمی اور نیم سیاسی خبروں میں دبی دکھائی

دی۔

"......امریکہ سے تعلقات میں تناؤ کے بعد نئے امکانات کا جائزے لے رہے ہیں۔" 2011ء Beacon, London, Sat, ... May-2011

شاید اس خبر کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو......شاید یہ من گھڑت کہانی ہو......لیکن شہریار کی چھٹی حس نے اس سے سرگوشی کی: "اس خبر کے نیچے پنسل سے سرخ لیکر کھینچو۔"

وہ اس ساری مشق سے تھک ہار کر سو گیا، مگر نیند میں بھی ذہن کسی گوشے میں دوسطری خبر گردش کرتی رہی......اور پھر اسے جیسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ اس کی آنکھ اضطراری طور پر کھل گئی......بالآخر وہ روشنی کا نقطہ جگنو کی طرح اندھیرے میں جگمگانے اور اس کے گرد منڈلانے لگا......وہ روشنی کا نقطہ جس کے لیے وہ بھٹک رہا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور انٹرنیٹ پر دوسطری خبر کے سیاق سباق ڈھونڈنے لگا۔ اس کو میڈیا نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی یا کسی اور سبب سے نہ تو نمایاں ہوئی، نہ اس کے تجزیے اور اس کے بارے میں بحث مباحثے کی نوبت آئی لیکن شہریار کے لیے یہ دبی ہوئی یا دبائی ہوئی خبر اس لیے قابل غور تھی کہ اس خبر کے چند ہفتوں بعد ملک کی بیک چینل یا بیک ڈور ڈپلومیسی کے ایک ماہر کا ایک خاص ملک کے دارالحکومت میں آنا جانا شروع ہو گیا جو تین وجوہات کی بنا پر اہم تھا:

(۱) مذکورہ ملک دنیا کی ایک ابھرتی ہوئی طاقت تھی جسے رفت گزشت سمجھا جاتا تھا، لیکن اب وہ دوبارہ زور پکڑ رہی تھی۔

(ب) بیک ڈور ڈپلومیٹ کی آمد و رفت کو خفیہ رکھا گیا اور شہریار کو کافی تگ و دو اور کھوج کے بعد اس کے بارے میں معلوم ہوا۔

(ج) دو ماہ بعد ایک اور عہدیدار......اور پھر سب سے بڑے عہدیدار کا وہاں جانا......چہ معنی دارد۔

آہستہ آہستہ بکھری ہوئی کڑیاں جڑنے لگی تھیں بلکہ ہلکا سا خاکہ بھی غبار راہ سے ابھر رہا تھا۔

"تو یہ ہے بات۔"

شہریار کی آنکھیں مکمل طور پر کھل چکی تھیں اور اس کے ذہن میں کئی سو واٹ کا بلب جلنے لگا تھا۔ اس نے معاملات کے مختلف پہلوؤں اور تفصیلات کا مزید سراغ لگایا اور اپنی تحقیقی رپورٹ لکھنی شروع کی۔

آخر اس نے اپنی رپورٹ مکمل کر لی اور اپنے اخبار کے ایڈیٹر سے ملاقات کی درخواست کی اس خوشخبری کے ساتھ کہ وہ انکشافات کرنے والا ہے جس سے اخبار کی اشاعت میں مزید چونکا دینے والا اضافہ ہوگا۔ ایڈیٹر نے اُسے ملاقات کے لیے بارہ بجے رات کا وقت دیا۔

وہ رات بارہ بجے سے پہلے اپنی کھٹارا مہران سوزوکی پر گھر سے نکلا......اور پھر زندہ گھر نہیں لوٹا۔ اس کی پراسرار گمشدگی کی رپورٹ درج ہونے کے کئی روز بعد اس کی کار شہر سے باہر ہائی وے سے کئی گز پرے کچے میں خالی ملی اور لاش اس سے بھی پرے ایک برساتی پل کے نیچے۔ بظاہر اس پر تشدد کے کوئی آثار نہیں تھے مگر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق الٹے ہاتھ کی دو پسلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں جو غالباً زوردار ٹھڈوں کے باعث ٹوٹیں۔ ڈاکٹروں کی رائے میں ٹھڈوں کی شدت سے دل کا دورہ پڑا جس سے اس کی موت واقع ہوئی۔

اخبارات اور ٹی وی چینلز نے اس بہیمانہ قتل کی خبر کو اچھالا اور اس کے محرکات کو کھنگالا، پڑھے لکھے حلقوں نے غم و غصہ کا اظہار کیا۔ سیاست دانوں نے اس واقعے کی "مذمت" کی، مبصروں نے طریقہ واردات، واقعے کے پس منظر اور وجوہات پر تفصیلی گفتگو کی۔ ایک قیاس یہ پیش کیا گیا کہ یہ ملکی حساس اداروں کا کام تھا۔ دوسرے قیاس کی رو سے غیر ملکی ایجنٹوں کا، جو کافی تعداد میں ملک میں سرگرم عمل تھے ایک نظریہ یہ تھا کہ ہمسایہ ملک کی انڈر ورلڈ ملوث تھی اور تیسرا نظریہ یہ تھا کہ عالمگیر دہشت گرد تنظیموں کا اس قتل میں ہاتھ تھا۔

دنوں تک شہریار کی گاڑی لاش کے کلپس (Clips) اور قتل کی خبر ٹی وی کے ناظرین کو تڑپانے کے بعد اچانک پردہ سیمیں سے غائب ہو گئی۔ روداد عشق طاق نسیاں میں دھری رہی......جو رہی سو بے خبری رہی......نہ جنوں رہا نہ پری رہی۔

ایک دن جب ایک وزیر سے شہریار کے رفیق کار نے اس کے قتل کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا: "چلو جی! مٹی پاؤ۔"

اور شہریار واقعی منوں مٹی تلے دب گیا جس کا نوحہ پڑھنے کوئی نہ چلا......نہ کوئی لکھاری، نہ کوئی نظم گو۔

ایک بات جس کا شاید کسی کو علم نہیں کہ دمِ آخر جب اسے وہ جان لیوا ٹھڈا لگا جس سے اس کی حرکت قلب بند ہوئی تو اسے کسی شاعر کی کوئی نظم یاد نہیں آئی۔ اس پل نہ سورج تھا......نہ چاند......نہ تارے......بس درد کی شدت تھی......اذیت کی انتہا تھی......اور پھر اندھیرا......گہرا اندھیرا......جس نے اس کے وجود کو سیاہ چادر میں لپیٹ دیا۔

شاعری

کیا خبر کیوں ہیں درختوں کے بدن ٹوٹے ہوئے
اور زخموں کے شگوفے جابجا پھوٹے ہوئے

خوب صورت عکس تھے بے صورتوں میں بٹ گئے
یوں بکھر کر رہ گئے ہیں آئینے ٹوٹے ہوئے

چہچہے پیڑوں پہ ہیں اور زمزمے ہیں جھیل پر
بن میں پنچھی لوٹ آئے قید سے چھوٹے ہوئے

بے سرو ساماں ہیں ہم یہ آپ ہی کہیے حضور
اب کہاں سے مل سکیں گے جان و دل ٹوٹے ہوئے

اک نظر میں بھید ہم پر کھل گیا تھا دوستو
رہ نما سب بازی گر اور چارہ گر جھوٹے ہوئے

رنج فرقت کی عجب ہے دست کاری دیکھیے
نقش گر رومال پر اشکوں کے گل بوٹے ہوئے

یوں چلیں ثاقبؔ ہوائیں خیر کی اس گاؤں میں
آ گئے واپس گھروں کو لوگ سب روٹھے ہوئے

آصف ثاقبؔ/ ہزارہ

کم ہی میرا وہ ہم خیال رہا
دوستی میں مگر مثال رہا

اُس کہانی میں یہ کمال رہا
میرا کردار حسب حال رہا

ذہن جکڑا رہا مرا پیہم
سوچ کا سلسلہ وبال رہا

اُس کے افکار باغیانہ تھے
لیکن اخلاق باکمال رہا

سانحہ تھا بہت ہی وہ دلسوز
جس کا برسوں مجھے ملال رہا

گفتگو بھی اُنھیں گراں گزری
کچھ نہ کہنا بھی اک سوال رہا

ایسے حالات بھی رہے درپیش
سانس لینا مجھے محال رہا

راحتیں دے رہا ہے اب مجھ کو
وہ جو راشدؔ کبھی وبال رہا

ممتاز راشدؔ لاہوری/ لاہور

پیار اُس نے بے کراں کرنا ہی تھا
مجھ زمیں کا آسماں کرنا ہی تھا

بار ناراضی اُٹھاتے کب تلک
اس کو آخر مہرباں کرنا ہی تھا

دے گیا مجھ کو دلاسے بے سبب
بدگماں کو خوش گماں کرنا ہی تھا

جانتا تھا وہ کہ ہوں اُس کا رقیب
اُس نے مجھ کو رازداں کرنا ہی تھا

کیوں اُٹھاتے منت ابرِ کرم
دھوپ کو جب سائباں کرنا ہی تھا

کیوں دیا اس نے مجھے اذنِ کلام
اس قدر جب بے زباں کرنا ہی تھا

سرخرو، ایوب ہونے کے لیے
زندگی کو امتحاں کرنا ہی تھا

ڈاکٹر ایوب ندیم/ لاہور

نہ آسماں کی نہ وہ آستاں کی قید میں ہے
عجیب شخص ہے اپنی زباں کی قید میں ہے

سلگتی دھوپ کے منظر ہیں میری آنکھوں میں
مگر سراپا میرا سائباں کی قید میں ہے

ترے کلام کی وسعت کا راز پا جائے
وہ ایک نقطہ جو اَب تک گماں کی قید میں ہے

ثبات گل کو ہے خوشبو کو ہے نہ شبنم کو
کہ حُسن رعب چمن بھی خزاں کی قید میں ہے

گرہ نہ کھول سکی میں کنولؔ اُداسی کی
کہ لمحہ لمحہ تو سود و زیاں کی قید میں ہے

آسناتھ کنولؔ/ لاہور

ہجر کی ایک داستاں ہوں میں
ایک لمحہ جاوداں ہوں میں

آ گیا ہوں ایک ایسی بستی میں
سوچتا ہوں کہ اب کہاں ہوں میں

بول سکتا ہوں اپنے حق کے لیے
یہ نہ سمجھو کہ بے زُباں ہوں میں

یہ محبت مرا اثاثہ ہے
اس محبت کا رازداں ہوں میں

مجھ کو حیرت سے دیکھنے والو!
تم ہو گر تیر تو کماں ہوں میں

قدر کرتا ہے یہ زمانہ مری
اُس کی نظروں میں رائیگاں ہوں میں

راس آتی ہے مجھ کو تنہائی
اب اکیلا ہی کارواں ہوں میں

مسعود تنہا/لاہور

سرِ تاریخ صدیوں کا سفر تحریر کرتی ہیں
اگر اخلاص شامل ہو اثر تحریر کرتی ہیں
زُباں چہرے اور آنکھیں تو چھپا لیتے ہیں سچائی
عیاں سب حالتیں دل کی مگر تحریر کرتی ہیں
اُڑا دیتی ہے اُس کی دھجیاں نقاد ہے دنیا
کہانی جو محبت کی نظر تحریر کرتی ہے
دکھاتا ہے کرشمہ کچھ مقدر بھی مگر یارو
ہنر کو دارِ فانی میں امر تحریر کرتی ہے
اُدھر اہلِ ہوس آزاد کو مجبور کرتے ہیں
عطا بے بال و پر کو پر اِدھر تحریر کرتی ہے
خریدیں شہرتیں جھوٹی جو دولت کے وسیلے پر
دیارِ فن میں اُن کو دربدر تحریر کرتی ہے
فسانا مت اِسے سمجھیں سند ہے ساری دنیا میں
ستم کی کالی راتوں کو سحر تحریر کرتی ہے
زمانہ بے سبب بدنام کرتا ہے ہواؤں کو
اِدھر سے جو بھی کرتی ہے اُدھر تحریر کرتی ہے
بجھا دیتی ہیں نفرت کے الاؤ کو بھی تحریریں
دبی چنگاریوں کو بھی شرر تحریر کرتی ہے
سلیم اس بات سے انکار کرنا کیسے ممکن ہو
کہ ہر پودے کو جلدی سے شجر تحریر کرتی ہے

عمران سلیم/لاہور

شہرت کی بھوک ہے نہ کوئی نام چاہیے
اپنے وجود کا مجھے اِبرام چاہیے
کیا ہوں، کہاں ہوں، کتنا ہوں اس کائنات میں
اپنے مقام کا فقط اِتمام چاہیے
بے خود ہوں اس طوافِ خراباتِ زیست میں
مستی میں تار تار ہوں، احرام چاہیے
برداشت اک وجود نہیں ہے وجود کو
ہر ایک کو ہر ایک سے بس کام چاہیے
روحوں کا احترام تو کرتے ہیں یار لوگ
جسموں کو بھی یہاں کوئی اکرام چاہیے

سہیل یار/لاہور

یار نے خوب امتحان لیا
راز بھی ہم نے اب یہ جان لیا
تیری مرضی تو جس طرح چاہے
جو کہا ہم نے وہی مان لیا
وقتِ تقسیم ہم نے ماں لے لی
تو نے سارا بھرا مکان لیا
اپنی آنکھوں میں روشنی بھر لی
تیری آنکھوں کا بس جہان لیا
آدمی ایک بھی ملا نہ ہمیں
یہ زمانہ تو ہم نے چھان لیا
دھوپ میں دشت میں شجر کی جگہ
تیری یادوں کا سائبان لیا
رکھ دیا سب تمہارے قدموں میں
ہم نے دھرتی نہ آسمان لیا

راؤ وحید اسد/ملتان

دُکھوں کے پار تو کچھ بھی نہیں ہے
پسِ دیوار تو کچھ بھی نہیں ہے
عذابِ زندگانی سے ہیں گزرے
ترا انکار تو کچھ بھی نہیں ہے
کہانی کروٹیں لیتی رہی ہے
مرا کردار تو کچھ بھی نہیں ہے
اگر میں خود کو اس سے منفی کر دوں
تو یہ سنسار تو کچھ بھی نہیں ہے
یہ دوش اک رائیگانی کا جہاں ہے
ہماری ہار تو کچھ بھی نہیں ہے

نزاکت علی دوش/فیصل آباد

کاغذ پر اک پھول بنایا جا سکتا ہے
یونہی اپنا دل بہلایا جا سکتا ہے
کوئی اپنا دوست نہیں تو دیواروں کو
اپنے دل کا حال سنایا جا سکتا ہے
شاید ایسے دکھ کی شدت کم ہو جائے
دُکھ میں کوئی نغمہ گایا جا سکتا ہے
ظلم جہاں پر بڑھ جائے فرمان یہی ہے
اُس بستی کو چھوڑ کے جایا جا سکتا ہے
ویسے اپنا لوٹ کے آنا مشکل ہے اب
لیکن تیری خاطر آیا جا سکتا ہے
رات کو تنہا جاگنا مشکل ہے تو آصف
چاند کو اپنا دوست بنایا جا سکتا ہے

آصف نیاز/لاہور

ابرار ندیم کے لیے نظم

''یہ نظم ابرار ندیم کے شعری مجموعے ''اساں دل نوں مرشد جان لیا کی تقریب پذیرائی میں پڑھی گئی''

دولت نہ ہی شہرت کا طلب گار ہے ابرار
ظلمت سے فقط برسرِ پیکار ہے ابرار
ہر پھول جدا رنگ کا ہے تیرے چمن میں
شعروں میں ترے اپنی ہی مہکار ہے ابرار
جو تجھ سے ملا ہو گیا گرویدہ وہ تیرا
کیا تیرا تخیل تری گفتار ہے ابرار
یہ بات حقیقت ہے کہ اس شہرِ ادب میں
بے داغ مثالی ترا کردار ہے ابرار
شوخی میں شرارت میں کوئی ان سا نہیں ہے
نوخیز ہے نوخیز تو ابرار ہے ابرار
مرشد کی طرف آتے ہوئے تیروں کے آگے
پربت ہے، چٹاں ہے کوئی دیوار ہے ابرار
اس بات پہ ہے فخر سدا فخر رہے گا
ابرار مرا دوست، مرا یار ہے ابرار
تقریب پذیرائی تری ہوتی رہے گی
تجھ سے تو دل و جاں سے ہی پیار ہے ابرار
وہ پھول ہی بن جائے مرے دل کی دعا ہے
جو بھی ترے رستے میں پڑا خار ہے ابرار
ہو جتنی پذیرائی تری اُتنی ہی کم ہے
تو اس سے زیادہ کا ہی حق دار ہے ابرار
ہمدرد عزیر اس کو سدا پایا ہے میں نے
دیکھا ہے کئی بار کہ غم خوار ہے ابرار

عزیر احمد/لاہور

نظم

حلقے میں تنقید کی خاطر
نظم نئی اک لکھنی ہے
تو کیا لکھوں اب
گھر سے دوری پر اک خالی بند کمرے کی وحشت
جذبوں کی قربانی لے کر مٹتی بھوک کا نوحہ
پت جھڑ کی گودی میں پلتے ہجر کا دُکھ
یا دکھ حاصل لاحاصل کا
تنہائی کے مارے کی تخلیق بھی ہو گی تنہائی
ہر احسن تخلیق کا محور دکھ ہی دکھ ہے
آنے کا دکھ، کھونے کا دکھ، پانے کا دکھ اور پھر
لوٹ کے جانے کا دکھ
سر پر خاک لیے قرنوں کی
میں......
صدیوں کی وحشت کا پالا
ہونے نہ ہونے میں اُلجھا
خود حیران کھڑا ہوں کب سے
کیا لکھوں اب
حلقے میں تنقید کی خاطر
نظم نئی اک لکھنی ہے

نیازت علی نیاز/مانسہرہ

ہمارا وطن

پاک وطن جنت کا ٹکڑا
ہرا بھرا ہے گوشہ گوشہ
پربت اور صحرا ہیں ہنستے
خوشحالی کے ضامن دریا
اس کا ہر گوشہ گلدان
وطن ہمارا پاکستان

سات دہائیاں گزر گئی ہیں
ساری سوچیں بکھر گئی ہیں
لوگو! ٹھنڈے دل سے سوچو
کیا تقدیریں سنور گئی ہیں

باندھا تھا ہم نے پیمان
وطن ہمارا پاکستان

لاکھوں جانیں دے کر پایا
قائداعظمؒ نے فرمایا
ہم سب ہیں اس کے رکھوالے
یہ ہے ہم سب کا سرمایہ

اس سے ہے اپنی پہچان
وطن ہمارا پاکستان

تاج انصاری/لاہور

مبارک باد

ہم ادب نواز اور کتاب دوست شخصیت
پرنسپل پی آر لیڈی گریفن گرلز ہائی سکول
محترمہ مسز نسرین علی اعوان
کو عمرہ کی سعادت حاصل کرنے پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارک پیش کرتے ہیں۔
منجانب: سمعیہ احسن گل

امریکی سرحد کے اُس پار

عامر بن علی/ جاپان

یہ "تی خوانا" ہے، امریکہ اور میکسیکو کا سرحدی شہر۔ تی خوانا کا ائیرپورٹ امریکی ریاست کیلی فورنیا کی سرحد سے بالکل ملحقہ واقع ہے۔ ائیرپورٹ پر لینڈ کرتے ہوئے آپ کو کیلی فورنیا کا براؤن فیلڈ میونسپل ائیرپورٹ صاف نظر آتا ہے۔ ہالی وڈ کی فلموں کے ذریعے جو اس شہر کا تعارف اب تک ہو اتھا اس میں تو یہاں صرف ڈرگ لارڈ اور جرائم پیشہ افراد ہی ملتے ہیں اور مافیا کی اس شہر میں عملی طور پر حکومت ہے۔ انسانی سمگلر یہاں دندناتے پھرتے ہیں۔ آپ اسے میری خوش قسمتی کہہ لیں کہ مجھے یہاں ابھی تک کوئی بھی ایسا شخص نہیں ملا جس کے انڈرورلڈ کے ساتھ روابط ہوں حالانکہ میں تو سارا دن پیدل ہی شہر کی خاک چھانتا رہا۔ یہاں جو لوگ ملے وہ تو بڑے بھلے مانس اور مجہتی سے لگتے ہیں۔

صبح کے وقت ناشتہ کر کے جب چہل قدمی کے لئے نکلا تو مرکزی سڑک پر واقع ایک اوور ہیڈ برج پر لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ یہ ائیرپورٹ سے ملحقہ علاقے کا ذکر ہے۔ عوام الناس کی کثیر تعداد دیکھ کر میں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے پل کے اوپر جا پہنچا۔ تمام لوگوں کا رخ ائیرپورٹ کے رن وے کی طرف تھا۔ وہ سب لوگ جہازوں کے اترنے اور چڑھنے کا غالباً منظر دیکھ رہے تھے۔ ناظرین میں بہت بڑی تعداد بچوں اور خواتین کی تھی اور ہر عمر کے مرد بھی موجود تھے۔ والدین بچوں کو جہازوں کے متعلق معلومات بہم پہنچانے میں مصروف تھے۔ عوام کی اس مستقل بھیڑ سے فائدہ اٹھانے کے لئے بہت سے چھابڑی فروش بھی پل پر براجمان تھے۔ انہی چھابڑی فروشوں میں سے ایک جو کہ مختلف جہازوں کے پلاسٹک سے بنے ہوئے ماڈل فروخت کر رہا تھا، میں نے اس سے پوچھا کہ یہ سب لوگ یہاں کیوں جمع ہیں؟ مجھے تو یہ سب کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اس آدمی نے مجھے جو وضاحت پیش کی وہ بھی کمال تھی، وہ کہنے لگا کہ اس ہجوم میں شامل لوگوں میں سے نوے فیصد وہ ہیں جو اپنی زندگی میں کبھی بھی جہاز پر سوار نہیں ہوئے ہیں، کچھ تو جبلی تجسس سے مغلوب ہو کر پہنچے ہیں، باقی بہت سے والدین ایسے ہیں جن کے بچے جہاز میں بیٹھنے کی یا پھر جہاز دیکھنے کی فرمائش کرتے ہیں، بچوں کا جی بہلانے کے لئے وہ انہیں اس جگہ لے آتے ہیں، انہی بچوں کو پلاسٹک کے ہوائی جہاز بیچ کر ہماری روزی روٹی بھی چل رہی ہے۔

دو ہمسایہ ملکوں کے درمیان اس سے زیادہ معاشی فرق کی مثال پوری دنیا میں کہیں نہیں ملتی جتنا فرق امریکہ اور میکسیکو کے درمیان ہے۔ اس پل سے امریکی سرحد اور سرحدی کھمبے بھی صاف نظر آتے ہیں جن پر لگے زرد قمقموں کی قطار رات کے وقت دور سے دیکھنے پر روشنی کی ندی محسوس ہوتی ہے۔ سرحد کے اس پار لاس اینجلس میں تین، چار مرتبہ میرا جانا ہو چکا ہے۔ کیلی فورنیا کا قصبہ سان ڈیاگو تو بالکل ہی پاس ہے۔ تی خوانا اور سان ڈیاگو کے درمیان بارڈر کراسنگ بھی موجود ہے جیسے لاہور اور واہگہ کے مقام پر جہاں پیدل سرحد عبور کی جاسکتی ہے۔ ہر سال پانچ کروڑ لوگ امریکہ اور میکسیکو کے درمیان واقع کراسنگ عبور کرتے ہیں۔ جس کی بنیاد پر اسے دنیا کی مصروف ترین بارڈر کراسنگ کہا جاتا ہے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ اتنی قربت کے باوجود امریکہ اور میکسیکو دو علیحدہ علیحدہ دنیائیں ہیں۔ رنگ، نسل، زبان کا فرق کوئی بڑی بات نہیں ہے، زندگی گزارنے کا ڈھنگ دونوں ملکوں میں اتنا مختلف ہے کہ لگتا ہی نہیں کہ یہ دونوں ملک ایک ہی سیارے پر واقع ہیں۔

آج تو یہ تصور سے بھی ماورا لگتا ہے کہ 1847 تک کیلی فورنیا کی پوری ریاست میکسیکو کا حصہ تھی اور امریکہ نے جب میکسیکو پر جنگ مسلط کرنے کے بعد کیلی فورنیا پر قبضہ کر لیا تو امن معاہدے میں جو شرمناک شرائط رکھی گئیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اب کیلی فورنیا سمیت میکسیکو کا بہت سارا علاقہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا حصہ ہوگا۔ چونکہ سپین کی نوآبادیاتی حکومت سے آزادی حاصل کئے میکسیکو کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اس لئے عسکری اعتبار سے امریکی افواج کی مزاحمت کرنا ان لوگوں کے لئے ممکن بھی نہ تھا۔ یہاں یہ تذکرہ بھی مناسب ہوگا کہ برطانیہ کے برعکس سپین اپنی نوآبادیات سے عزت کے ساتھ رخصت نہیں ہوسکا۔ تقریباً ہر نوآبادی سے ہزیمت اٹھانے کے بعد ہی نکلا ہے۔ میکسیکو سے بھی دس سالہ

خانہ جنگی کے بعد شکست فاش کا امکان دیکھا تو پھر دم دبا کر بھاگ گیا۔ یہ دلچسپ بات بتاتا چلوں کہ سرحد کے اس طرف جہاں میکسیکو کا پانچواں بڑا شہر تی خوانا واقع ہے یہ ریاست بھی کیلی فورنیا زیریں کہلاتی ہے۔

خوان کارلوس میکسیکو میں فروٹ اور سبزیاں فراہم کرنے والی چھوٹی سی کمپنی چلاتا ہے۔ اس نوجوان نے مجھے بتایا کہ امریکہ اور میکسیکو کے درمیان باہمی تعلقات بھی ویسے ہی ہیں جیسے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ہیں۔ خوان کارلوس تین سال تک برطانیہ میں رہ چکا ہے۔ جہاں برصغیر سے آئے تارکین وطن کی ایک کثیر تعداد موجود ہے، اس لئے وہ پاک وہند مخاصمت سے بخوبی واقف ہے۔ میکسیکو کے لوگوں کی امریکہ سے نفرت اس لئے عجیب لگتی ہے کہ روزانہ اس شہر سے کیلی فورنیا جانے اور آنے والوں کی تعداد تین لاکھ ہے۔ ہر تیسرے، چوتھے گھر کا کوئی فرد امریکہ میں موجود ہے۔ شائد اس کی بھی وہی وجوہات ہیں جو ہمارے اور ہندوستان کے موجودہ تعلقات کی ہیں۔

میکسیکو میں ایک اور عجیب وغریب بات دیکھی۔ قدیم مقامی قبائل کے مقبروں کی جگہ کلیسا تعمیر کردیئے گئے ہیں۔ میں نے خوان کارلوس سے کہا کہ ویسے تو تم لوگ ہم مسلمانوں کو طعنہ دیتے ہو کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا ہے، مگر یہ سب کیا ہے؟ تاریخی اعتبار سے دیکھیں تو نہ صرف شمالی اور جنوبی امریکہ کے براعظم بلکہ آسٹریلیا میں بھی عیسائیت کے غلبے کی واحد وجہ یورپی ممالک کا وہاں تسلط اور ان کا مسلط کردہ نوآبادیاتی نظام ہے۔ شمالی اور جنوبی امریکہ میں تو مقامی مذاہب شاید دو تین فیصد بھی وجود نہیں رکھتے اور اپنی بقاء کی آخری جنگ لڑ رہے ہیں۔ ایسے حقائق کے باوجود مسلمانوں کو الزام دینا کہ ان کا مذہب تلوار کے زور پر پھیلا ہے، زیادتی نہیں ہے؟ میرے سوال کے جواب میں خوان کارلوس مسکرا کر کہنے لگا کہ سچی بات تو یہ ہے کہ ہر طاقت ور کا نظریہ پھیلتا ہے۔ محکوم کا نظریہ کہیں بھی نہیں پنپتا، براعظم چاہے دنیا کا کوئی بھی ہو۔

ہم باتوں میں مشغول تھے کہ یکا یک کالی بدلی آئی اور بارش شروع ہوگئی۔ امریکہ اور میکسیکو میں منقسم کیلی فورنیا کی ریاست میں ایک چیز سرحد کے دونوں جانب مشترک ہے، وہ ہے موسم اور بارش کے سبب زمین سے اٹھتی مٹی کی سوندھی خوشبو۔

لبنیٰ صفدر / لاہور

تیرگی بھی کم نہیں ہے روشنی بھی کم نہیں
موت بھی چاروں طرف ہے زندگی بھی کم نہیں
شہر میں احساسِ تنہائی زیادہ ہے مگر
جس جگہ جائیں وہاں پر آدمی بھی کم نہیں
اک یہی خوبی محبت کو بنائے جاوداں
چاہے جتنی ہو پرانی یہ نئی بھی کم نہیں
کیسے دورا ہے پہ انساں آ گیا ہے آج کا
جانتا کچھ بھی نہیں تو آگہی بھی کم نہیں
پھرتے رہتے ہیں یونہی ہم ساری دنیا میں مدام
ویسے زندہ رہنے کو اس کی گلی بھی کم نہیں
دھوپ چھاؤں میں نہاں ہے زندگی کا حسن بھی
آنکھوں میں غم ہی غم ہیں اور خوشی بھی کم نہیں
وقت اچھا کٹ رہا ہے لبنیٰ میرا آج کل
زندگی بھی کم نہیں اور شاعری بھی کم نہیں

لبنیٰ صفدر / لاہور

دھول سے تھیں اٹی ہوئی آنکھیں
تم سے مِل کر نئی ہوئی آنکھیں
کیسے جاؤں گی اُٹھ کے گھر اپنے
یہ تری روکتی ہوئی آنکھیں
ایک پل میں ترا ہوا یہ دل
ایک پل میں تری ہوئی آنکھیں
بات کرنے کی ہے مجال کہاں
ہائے وہ بولتی ہوئی آنکھیں
دیر سے پاس بیٹھے ہیں دونوں
سپنوں سے ہیں بھری ہوئی آنکھیں
تیرے ہوتے بھی تجھ کو ڈھونڈتی ہیں
اس طرح باوری ہوئی آنکھیں
سونے دیتی نہیں مجھے لبنیٰ
اُس کی وہ جاگتی ہوئی آنکھیں

ہم ممتاز شاعرہ، کالم نویس اور ماہنامہ ارژنگ کی مدیرہ

محترمہ لبنیٰ صفدر

کو ایم فل کا مقالہ بہ عنوان

پاکستانی غزل اکیسویں صدی میں

مکمل کرنے اور ایم فل کی ڈگری حاصل کرنے پر
ماہنامہ ''ارژنگ'' کی طرف سے
مبارک باد پیش کرتے ہیں

کوالالمپور کا سفر

سعدیہ بتول/راولپنڈی

اگست 2010ء میں ہماری رگ سیاحت پھڑکی اور نگاہ انتخاب جنوبی ایشیا کے ایک اسلامی ملک ملائیشیا پہ جا ٹھہری۔ ویزہ اور ٹکٹ کے مراحل سے گزرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ہمیں ایک ماہ ملائیشیا میں گزارنے کی اجازت مل گئی ہے۔ سامان سفر تیار کیا اور ٹائیگر ائیرویز کے پروں پہ پرواز کرتے سنگاپور کے چانگی ہوائی اڈے پر جا اترے اس ملک میں دو ہفتے گزارنے کے بعد ہمیں زمینی راستے سے ملائیشیا جانا تھا۔ ملائیشیا کی سرحدیں تھائی لینڈ، برونائی، انڈونیشیا سے ملتی ہیں جبکہ سنگاپور کو ایک پل کے ذریعے ملائیشیا سے ملا کر دونوں ممالک میں آمد ورفت کو آسان بنایا گیا ہے۔ لگژری بس کے ذریعے یہ سفر ایک تفریح سے کم نہیں ہے۔ سیٹیں بہت آرام دہ ہیں جو بیٹھنے لیٹنے کے علاوہ ڈائننگ ٹیبل کی سہولت بھی مہیا کر دیتی ہیں۔ آس پاس کے خشک وتر نظاروں کو نگاہوں میں سموتے ملائیشیا کے بارڈر پر پہنچے تو بس رک گئی تمام مسافر قطار بنائے اترے اور اپنے سامان کی تلاشی اور پاسپورٹ پر مہریں لگوانے کا مرحلہ طے کر کے بقیہ سفر کیلئے بس پر سوار ہوئے اور کوالا لمپور میں بنے بس اسٹاپ پہ پہنچ گئے۔ کوالالمپور ملائیشیا کا دارالحکومت ہے۔ یہاں سے ٹیکسی کے ذریعے ہوٹل تک پہنچے جس میں انٹرنیٹ کے ذریعے ایک روز قبل ہی بکنگ کا مرحلہ طے کر چکے تھے۔ ٹیکسی کا کرایہ رنگٹ میں ادا کر کے ہوٹل تک رسائی حاصل کی۔ کمرے میں پہنچ کر سامان وغیرہ رکھا۔ اگلے روز سے سیر و سیاحت کا آغاز ہوا۔ یہاں کے لوگوں کو مالے کہا جاتا ہے۔ ان کی قومی زبان ملائی ہے جسے ملائیشین بھی کہلاتی ہے ۔ملائیشیا ملٹی کلچرل ملک ہے جس میں 62 فیصد مسلمان، 22 فیصد چینی، 9 فیصد عیسائی، 7 فیصد ہندو آباد ہیں۔ جرائم کی سطح اگرچہ زیادہ ہے لیکن ملکی ترقی میں بھی روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ ایک جیتا جاگتا شہر ہے جس کی رونق اور گہما گہمی دن رات جاری رہتی ہے۔ جب 1998 میں یہاں KLCC Twin Towers کی تعمیر مکمل ہوئی تو اس عمارت نے دنیا بھر کی بلند ترین عمارت کا اعزاز اپنے نام کیا ۔ بعد ازاں یہ اعزاز تائیوان کی ایک عمارت نے اس سے چھین لیا اور عہد حاضر میں یہ امتیاز دبئی کے برج الخلیفہ کو حاصل ہے۔ klcc میں بنے شاپنگ مالز میں ہر معروف برانڈ کی دکان موجود ہے۔ یہ خریداری اور تفریح کیلئے بہترین جگہ ہے۔ دونوں میناروں کو اکتالیسویں اور بیالیسویں منزل پر جا کر آپس میں ایک پل کے ذریعے ملایا گیا ہے جس پر سے شہر بھر کا نظارہ کرنا تحیر کن ہے۔ ان جڑواں میناروں کو پیٹروناس ٹون ٹاور بھی کہتے ہیں۔ ان کے سامنے خوبصورت پارک ہے۔ یہاں کئی ممالک سے لوگ سیاحت کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ ملائیشیا ایک سرسبز ملک ہے جس میں مختلف اقسام کے پودوں اور درختوں کی بہتات ہے۔ سیاحت کیلئے بھی یہاں بہت سے قابل دید مقامات موجود ہیں۔ سفر کی جدید سہولتیں میسر ہیں جن میں بسیں، ٹیکسیاں، ٹرینیں فیری اور MRT شامل ہیں۔ ملائیشیا کی نگارا مسجد خوبصورت اور دیدہ زیب تعمیر کی مظہر ہے جو مذہبی تقدس کے علاوہ اپنے طرز تعمیر کی بدولت بھی معروف ہے۔ ملائیشیا کا نگارا میوزیم بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے باہر فوارے لگے ہوئے ہیں اور سیڑھیاں چڑھ کر اندر داخل ہونا ممکن ہے۔ میوزیم کی بیرونی دیواروں پر بھی ازمنہ قدیم کے تصویری مناظر کھدے ہوئے ہیں جو سیاحوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اندر داخل ہوں تو اس ملک کی تہذیب و ثقافت کے مختلف نمونے اپنی اہمیت کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ مٹی کے نقشی ظروف، تانبے اور مس کے بنے ہوئے برتن اور دیگر اشیاء جن پر نہایت ہنر مندی سے مختلف بیل بوٹے اور نقش ونگار بنے ہوئے ہیں، پرانے وقتوں کے لباس اور جوتے، آلات جنگ اور زرہیں، قرآن پاک کے قدیم نسخے، گھریلو استعمال اور زراعت میں کام آنے والی اشیاء، دیوی دیوتاؤں کے بت اور بادشاہوں کے تخت و تاج اپنی عظمت رفتہ کا ثبوت دے رہے تھے۔ پرانے زمانے کے ہتھیار اور ذرائع نقل وحمل کے نمونے، پرانی عمارتوں کی

آرائشی اشیاء جن میں لکڑی کے کام والے دروازے محرابیں اور طاقچے وغیرہ محفوظ کیے گئے ہیں۔ اس ملک پر چونکہ مختلف اقوام مثلاً ہندوؤں، بدھ مت کے پیروکاروں، انگریزوں اور مسلمانوں کا راج رہا ہے لہٰذا اس عجائب خانے میں انہوں نے ہر دور کے مناظر دکھا کر اپنی تاریخ کا منظر نامہ نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے جو تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے توجہ کا باعث ہے۔ عجائب گھر کے نیم تاریک ہال سے باہر نکلے تو آنکھیں سورج کی روشنی سے چندھیا گئیں۔ قریب ہی لیک پارک ہے اور یہی ہماری اگلی منزل ٹھہری۔ ان باغات میں پانی کو ایک ترتیب سے چلایا گیا ہے۔ پودے اور ان پر کھلے رنگا رنگ پھول آنکھوں کو طراوت بخشتے ہیں۔ کوالالمپور کا بٹر فلائی گارڈن بھی بہت خوبصورت ہے۔ یہاں قدرتی حسن کے ساتھ انسانی چھیڑ چھاڑ نے مثبت نتائج دیئے ہیں اور تتلیوں کی بہت سی اقسام اڑتی پھر رہی ہیں ان کیلئے پھولوں کی بہتات ہے اور تتلیاں ڈال ڈال منڈلا کر ماحول کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہی ہیں۔ کافی بلندی پر ایک جالی نے اس باغ کو ڈھک رکھا ہے جو تتلیوں کو راستہ بھٹکنے سے بچاتا ہے۔ کئی تتلیاں اس جالی سے چپکی ہوئی تھیں شاید انہیں اس رکاوٹ پر کوئی اعتراض ہو۔ پارک میں ایک عمارت میں معلومات دینے والا عملہ بھی موجود تھا اس میں باقاعدہ آرٹ گیلری تھی جس میں تتلیوں کی مختلف تصاویر اور ان کے متعلق معلومات درج تھی۔ خریداری کیلئے بھی بہت سے جدید اور مہنگے شاپنگ مال موجود ہیں جن میں PAVILION , TIME SQUARE KLCC,BUKIT BINTANG, خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ دیارِ غیر میں اپنے ملک کا کوئی شخص یا چیز نظر آ جائے تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ یہی خوشی ہمیں اپنے ملک کی دستکاری کی نادر اشیاء دیکھ کر ہوئی ان میں پشمینہ شال، کشمیری شال، سندھی ، بلوچی، سواتی کڑھائی اور شیشے کے کام والے بیڈ کور اور ملبوسات شامل ہیں۔ جابجا عام مارکیٹیں بھی موجود ہیں جہاں ضرورت کی اشیاء سستے داموں دستیاب ہیں اور مول تول کر کے قیمتیں کم بھی کروائی جا سکتی ہیں البتہ برانڈڈ دکانوں میں اشیاء کی قیمتیں مختص ہیں۔ ایک روز بدھ مت کا ٹمپل گوان دی دیکھنے بھی گئے۔ یہ سرخ اور سنہرے رنگ سے ان کی روایتی طرز پر بنی ہوئی عمارت ہے جسے اژدھوں اور دیگر طاقت ور جانوروں اور مقدس اشخاص کے بتوں سے سجایا گیا تھا۔ اندر بدھا کے تین بت دوزانو شکل میں موجود تھے ان کے سامنے دیئے اور شمعیں جل رہی تھی۔ ایک سنہری تلوار بھی پڑی ہے جس کے بارے میں ان کا عقیدہ ہے کہ اس کو چھونے یا اٹھانے والے کی قسمت بدل جاتی ہے۔ چھت سے سرخ فانوس لٹک رہے تھے۔ کچھ پلیٹوں میں مٹھائیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ دو بڑی ہانڈیوں میں راکھ نما شے بھری ہوئی تھی اور ان میں اگربتی نما تیلیاں لگائی گئی تھیں جو جل رہی تھیں۔ ٹمپل میں ہر آنے والا ان میں کچھ تیلیوں کا اضافہ کر دیتا تھا۔ یہ ان کیلئے ایک طرح کا عافیت پانے کا انداز تھا۔ اندر ہال میں کسی شادی کی تیاری کے انتظامات کیے جا رہے تھے۔ باہر سے ہم نے اس عمارت کی کچھ تصاویر کیمرے میں محفوظ کیں۔ چینی شکل کے مختلف کرداروں کے بت بھی یہاں اپنی تہذیب کی نمائندگی کر رہے تھے۔ یہ علاقہ چائینہ ٹاؤن کہلاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پیٹالنگ اسٹریٹ ہے۔ اس میں چینی لوگوں کی مذہب سے متعلقہ اشیاء بھی دستیاب ہیں۔ دکانوں پر بدھا کے ہر زاویے اور ہر سائز کے بت مل رہے تھے۔ مکانوں میں خیر و برکت کیلئے لٹکانے والی اشیاء، پہننے کے لیے پتھر کے کڑے اور انگوٹھیاں جنہیں اچھی قسمت اور حفاظت کیلئے پہنا جاتا ہے دستیاب تھیں۔ چائنیز کھانوں کی دکانیں اور ریڑھیاں لگی ہوئی تھیں۔ وہاں گھومتے ہوئے ایک لمحے کیلئے تو یوں معلوم ہوا گویا ملائیشیا کے بجائے چین میں آ نکلے ہیں۔ اس سے تھوڑا آگے یہاں کا مقامی بازار ہے جس میں یہاں کے مقامی لباس خوراک اور دیگر اشیائے ضرورت دستیاب ہیں۔ کافتان اور اسکارف وغیرہ بک رہے ہیں کافتان ملائی لوگوں کا لباس ہے اور یہاں کی مسلمان خواتین سروں پر اسکارف بھی ضرور باندھتی ہیں۔ انڈین مسجد کے علاقے میں ہندستانی تہذیب وثقافت نمایاں ہے۔ ہندستانی ہوٹل ہیں جن میں انڈین کھانوں کے علاوہ پاکستانی کھانے بھی مل جاتے ہیں۔ اچار اور چٹنیوں کا اہتمام بھی دکھائی دیتا ہے۔ انڈین تھالی میں دال سبزی ابلے چاول ڈھوکلا اور تھیپلا سجے ہوئے تھے۔ ہوٹل میں داخل ہوں تو سامنے کالی ماتا گیندے کے ہار پہنے سواگت کرتی ہے۔ کوالالمپور میں کئی مندر بھی

موجود ہیں۔ جالان بندر میں واقع سری ماہا مریمان مندر کی بیرونی دیواروں پر کئی چھوٹے بڑے بت لگے ہوئے ہیں۔ یہ ہندو مذہب کی مکمل تصویر کشی کرتے ہیں ان کے لباس اور طور طریقے ہندی تہذیب کے عکاس ہیں۔ عمارت کے اندر گھنٹیاں لگی ہوئی ہیں، بت موجود ہیں اور پوجا پاٹ کا مکمل انتظام ہے۔ کوالالمپور میں BATU CAVES ہندوؤں کی قدیم عبادت گاہوں کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہاں پہنچ کر دور ہی سے مرگان کا ایک سنہرا بلند و بالا بت کھڑا نظر آتا ہے۔ اس کی بلندی بیالیس میٹر ہے۔ اس کے سامنے ایک مندر ہے جس کے باہر سلیٹی رنگ کے کبوتر دانہ چگ رہے تھے۔ اس بت کے پیچھے 272 سیڑھیاں ہیں جو اوپر لے جا کر غاروں کے ایک سلسلے تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں۔ ان سیڑھیوں پر بندر اچھلتے کودتے نظر آتے ہیں۔ یہاں آنے والے سیاح اور ہندو عقیدت مند اپنے ساتھ پھل وغیرہ ضرور لا کر انہیں پیش کرتے ہیں۔ جوں جوں اوپر چڑھیں آس پاس دیوی دیوتاؤں کے رنگین اور خوبصورت بنے ہوئے بت مختلف روپ میں متوجہ کرتے ہیں۔ فضاء میں بھجن گونج رہے تھے۔ اوپر پہنچ کر تھوڑا سانس بحال کیا منرل واٹر کی بوتل سے حلق تر کرنے کے بعد ارد گرد کے مناظر کی تصاویر کیمرے میں محفوظ کیں۔ ہندو عورتیں ساڑھیاں باندھے تلک لگائے بتوں کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی تھیں۔ مردوں کے چہروں پر بھی عقیدت کے آثار پھیلے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ چھوٹے بچوں پہ یہاں کی مٹی لیپ رہے تھے۔ منت کے دھاگے باندھ رہے تھے۔ اس یقین سے دیے جلا رہے تھے کہ ان کے من کی آشائیں اس کے بدلے میں ضرور پوری ہونگی۔ یہاں کچھ دکانیں بھی تھیں جہاں بھجوں کی سیڈیاں، پھولوں کے ہار، دیے، ہندوؤں کی مذہبی اشیاء کے علاوہ کھانے پینے کی چیزیں بھی دستیاب تھیں۔ ان غاروں کی تاریخ قریباً چار سو سال پرانی ہے انہیں دیکھ کر ان کی قدامت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان مندروں کا جائزہ لینے کے بعد حوصلے مجتمع کیے اور سیڑھیاں اترنے کا مرحلہ شروع کیا۔ اگلے روز ہمارا ارادہ گنٹنگ ہائی لینڈ جانے کا تھا۔ یہ کوالالمپور سے ایک گھنٹے کی ڈرائیو پہ سطح زمین سے کافی اونچائی پر پہاڑی سلسلہ ہے۔ ہم نے ٹیکسی کے ذریعے گنٹنگ کیبل کار تک کا راستہ طے کیا" اور ٹکٹ لے کر قطار میں اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔ مختلف ممالک کے لوگ یہاں سیاحت کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ یہاں کا موسم ٹھنڈا اور خنکی لیے ہوئے تھا۔ بلندی پر ہونے کے سبب آس پاس بادل تیرتے پھر رہے تھے۔ سر سبز پہاڑوں پر جا بہ جا روئی کے گالوں کی مانند بادلوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ اللہ اللہ کر کے کیبل کار کے دروازے پر پہنچے اور اپنا ہینڈ بیگ سنبھالتے ہوئے اندر جا گھسے سیٹوں پر بیٹھتے ہی تمام مسافروں کی تصاویر لی گئیں۔ یہ اس غرض سے کہ خدانخواستہ کوئی حادثہ پیش آ جائے تو لوگوں کو شناخت کرنے میں مدد مل سکے۔ شیشے کے ڈبے میں مقید ہو کر بلندی سے نیچے جھانکنے میں بہت مزا آ رہا تھا۔ نیچے جنگل اس قدر گھنے تھے کہ زمین نظر نہ آتی تھی۔ خود رو اگی ہوئے درخت اور ان پر چڑھی ہوئی بیلیں بھلی لگ رہی تھیں۔ ان پر رنگ برنگے پھول بہار کا سماں پیش کر رہے تھے۔ اوپر پہنچ کر لفٹ سے آزاد ہوئے۔ یہاں ایک بہت بڑا تھیم پارک ہے جس میں حیران و پریشان کر دینے والے رولر کوسٹر اور گھما کے رکھ دینے والے جھولے سیاحوں کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ بو لنگ وغیرہ کا بھی انتظام ہے۔ جوانوں کے علاوہ بوڑھے اور بچے بھی ان سب تفریحات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سیاحوں کیلئے اچھے اور جدید سہولیات سے آراستہ ریسٹورنٹ اور ریزورٹ موجود تھے ہوٹلوں میں کھانے کی مقامی ڈشوں کے علاوہ غیر ملکی کھانے اور بین الاقوامی فوڈ برانڈز بھی کامیاب بزنس کر رہے تھے۔ گنٹنگ کا کسینو بھی عالمی شہرت رکھتا ہے۔ کوالالمپور کی سیر کا ذکر یہاں کے برڈ پارک کے تذکرے کے بنا یقیناً ادھورا ہے۔ اس پارک میں مختلف النوع پرندے اڑتے پھر رہے ہیں۔ کہیں آبشاریں بنائی گئی ہیں تو کہیں تالابوں میں بطخیں تیر رہی ہیں۔ کچھ پرندے بنا پنجروں کے آزاد بھی پھر رہے تھے چنانچہ موقع غنیمت جانتے ہوئے ان کے ساتھ کچھ سیلفیاں لے لیں۔ کوالالمپور میں انڈیپنڈنس سکوائر بھی قابل دید مقام ہے۔ یہاں پر سلطان عبدالصمد کا محل اور اسی کے نام پر بنی ہوئی جامع مسجد خوبصورت عمارات میں شمار ہوتی ہیں۔ اتنا کچھ دیکھ لینے کے بعد بھی بہت سی چیزیں ان دیکھی رہ گئیں جن کیلئے پھر جانا پڑے گا بشرط زندگی۔

بزرگانِ دین کے شہر ملتان سے قلعہ دراور تک

ایم-آر-شاہد/لاہور

اکثر بیٹھے بیٹھائے اچانک کسی دوست کا سیر کے لیے پروگرام بنالینا دلچسپ بھی ہوتا ہے اور پریشان کن بھی۔ اسی طرح 30 ستمبر 2018ء بروز اتوار ہمارے دوست عبدالوہاب نے فون پر رابطہ کیا کہ ملتان جانے کا پروگرام ہے وہاں میرا ذاتی کاروباری کام بھی ہے اور اس بہانے ملتان کے بزرگان دین کے مزارات پر حاضری بھی ہو جائے گی۔ اگر فرصت ہے تو ساتھ چلیں ایک دو اور دوستوں سے بھی رابطہ کرتا ہوں اور جانا بھی ابھی ایک گھنٹے بعد ہے۔ میں ابھی اپنے مکان پر جو زیر تعمیر ہے پہنچا ہی تھا کہ اس کا حکم صادر ہو گیا۔ یہ حکم چلانے کا عادی ہے ماننے کا نہیں۔ کیا کسی نے خوب کہا ہے کہ یاری لگانی آسان ہے اور نبھانی مشکل ہوتی ہے اور میں کئی بات ان مشکلات سے گزر چکا ہوں۔

میں اسے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ میری مجبوریوں کو میری ہارمت سمجھنا میں ان راہوں سے بھی گزر چکا ہوں جہاں یار تو کیا اپنے بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ خیر! اس کی دوستی سے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا، گھر آ کر کپڑے تبدیل کیے اور یہ گاڑی لے کر آ گیا۔ راستے میں اس نے اپنے دو دوستوں ہارون (چینی) اور ولید ناصر کو لیا۔ ہم لاہور سے دوپہر کو تقریباً ایک بجے نکلے۔ ملتان روڈ پر گاڑی ڈال دی۔ وہاب نے سجاد گجر سے رابطہ کیا تو اس نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا کہ میں نے مکان کی تعمیر شروع کی ہے میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ اس کے انکار پر یوٹرن لیتے ہوئے دوستوں کو بھوک کا احساس ہوا۔ ٹھوکر سے آگے مین روڈ پر ایک ہوٹل سے دوپہر کا کھانا کھایا اور چائے پی۔ کھانے میں دال اور سبزی شامل تھی۔ گاڑی میں پسند ناپسند کے گانے چلتے رہے۔ گاڑی روڈ پر فراٹے بھرتی رہی۔ سفر کا آغاز بھی اچھا تھا۔ ہم سفر بھی اچھے تھے اور موسم بھی اچھا تھا مگر اندر کا موسم ابر آلود تھا۔

خیر! ہم راستے میں رکتے، کھاتے پیتے اور گپیں مارتے شام سات بجے ملتان پہنچے۔ ہارون نے اپنے کزن اویس اور دو چار دوستوں کو بہاولپور سے ملتان سیر کرانے کے لیے بلا لیا۔ ہمیں ان کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک پٹرول پمپ پر رک گئے۔ ان کے دوست بھی چند منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ ان سے علیک سلیک کے بعد پروگرام طے پایا کہ بزرگان دین کے مزارات پر حاضری دی جائے۔ ان کی گاڑی آگے تھی اور ہماری گاڑی ان کے پیچھے میں حسب عادت راستے میں بار بار عبدالوہاب کو تاکید کرتا رہا کہ پہلے اپنا کام کرنا جس مقصد کے لیے تم آئے ہو لیکن اس ضدی انسان نے توجہ نہ دی۔ سب سے پہلے ہم حضرت شاہ رکن عالم کے مزار مبارک پر حاضر ہوئے اور تصاویر بنائیں۔ مزار کے صحن کے تہہ خانہ میں بھی قبریں ہیں جن کی نشان دہی اوپر فرش پر کی گئی ہے۔ صحن کی لال رنگ کی اینٹوں پر لفظ "قبر" درج ہے۔ یہ کئی ایک قبریں ہیں یا ان کے مدیرین کی قبریں ہیں۔

حضرت شیخ ابوالفتح رکن الدین عالم سہروردی:

بچپن میں آپ کو پیار سے شاہ جلولہ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ رکن الدین عالم لقب ہے جو حضرت خواجہ شمس الدین تبریزی نے ابتدائی عمر میں آپ کو عطا فرمایا۔ آپ کی ولادت 9 رمضان المبارک 1649 بمطابق 1251ء ہجری ناصر الدین محمود کے ہوئی۔ آپ کی وفات 7 جمادی الاول 1735 ہجری بمطابق 1327 میں بعد محمد تغلق وصال فرمایا۔ حضرت شیخ صدرالدین عارف کے فرزند ارجمند اور حضرت غوث بہاء الدین زکریا کے پوتے تھے۔ والدہ محترمہ بی بی راستی حافظہ قران تھیں۔

مقبرہ حضرت شاہ رکن عالم۔

مقبرہ اس کی چار دیواری اور ملحقہ مسجد کی کلی اور تفصیلی مرمت بمطابق اصل بصرف 4 2 لاکھ 41 ہزار روپیہ شعبہ درست جالی محکمہ اوقاف کے ناظم منصوبہ جات جناب محمد ولی اللہ خان کی زیر نگرانی اکتوبر 1971ء میں شروع ہو کر مارچ 1976 کو مکمل ہوئی۔

یہاں سے زیارت کے بعد نکلے تو اویس نے ہمیں چپس اور کولڈ ڈرنک پلائی۔ اس کے بعد کچھ فاصلے پر حضرت بہاؤالدین زکریا کے مزار پر حاضری دی۔ یہ دونوں مزارات سطح زمین سے اونچائی پر بنے ہیں اور ان کے اردگرد باغات اور کچھ جگہیں خالی پڑی ہیں۔ ان کے مزار مبارک کے علاوہ اس گنبد کے اندر بے شمار سفید پتھر کی قبریں بنی ہیں اور بہترین طرز تعمیر کا نمونہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں سوا لاکھ قبریں ہیں۔ اردگرد برآمدوں میں بھی کافی تعداد میں مرقد پختہ موجود ہیں۔ ان میں 1935 میں کوئٹہ میں آنے والا خوف ناک زلزلہ میں شہید ہونے والے بھی شامل ہیں۔

جب وہ ملتان پہنچے تو یہ زمانہ شیخ الاسلام حضرت غوث بہاؤالدین زکریا کا تھا۔ آپ نے حضرت شاہ

شمس تبریز کی خدمت میں ایک دودھ کا پیالہ بھیجا جو لبالب بھرا ہوا تھا۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ یہ سرزمین اولیا اللہ سے بھری پڑی ہے۔ آپ نے اس پیالے میں پھول رکھ کر واپس بھیج دیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ میں پھول کی طرح تمام اولیاء میں منفرد ہوں گا۔۔ حضرت شاہ شمس تبریز عمر میں حضرت غوث بہاؤالدین زکریا سے بڑے تھے اور وہ اس وجہ سے ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ جب ان کے بڑے فرزند حضرت صدر الدین عارف کے گھر بیٹا پیدا ہوا اور کنیز نے شیخ الاسلام کی خدمت میں اطلاع دی تو انہوں نے حضرت شاہ شمس تبریز سے فرمایا کہ اس نومولود کا نام آپ تجویز فرمائیں چنانچہ حضرت شاہ شمس تبریز نے ان کا نام رکن الدین العالم رکھا۔

حضرت غوث بہاؤالدین زکریا اپنے عہد کے عظیم صوفی حضرت بابا وزیرالدین گنج شکر کے خالہ زاد بھائی تھے۔ اسی طرح حضرت شاہ شمس تبریز اپنے عہد کے ایک اور عظیم صوفی حضرت مخدوم شیخ عثمان المعروف حضرت لال شہباز قلندر کے خالہ زاد بھائی تھے۔ حضرت بہاؤالدین زکریا شیخ الاسلام کے منصب پر فائز تھے۔ عہد حاضر میں اس عہدے کو چیف جسٹس کہا جاتا ہے۔ حضرت شاہ شمس تبریز کی وفات 1276ء میں ملتان میں ہوئی۔ انہیں دریائے چناب کے کنارے موجودہ جگہ پر سپرد خاک کیا گیا۔ اس زمانے میں قلعہ ہند کے قریب مزار حضرت شاہ شمس ء تک دریائے چناب بہتا تھا۔ حضرت شاہ شمس تبریز کا موجودہ مقبرہ 1330ء میں تعمیر کیا گیا۔

ان دونوں مزارات سے فارغ ہوئے تو گاڑیوں میں حضرت شاہ شمس تبریز کے مزار کی جانب چلے۔ یہ شہر ملتان میں کچھ فاصلے پر واقع ہے مزار کی گلی میں دائیں بائیں تبرک، پھولوں اور کپڑے کی چادروں کی دکانیں ہیں۔ یہاں جا بجا علم نظر آتے ہیں اور مزار کے علاوہ اردگرد بے شمار قبور موجود ہیں۔ یہ ان کے مدیرین اور خاندان والوں کی ہیں سب کی سب پختہ ہیں ان قبروں پر تازہ تازہ روغن کیا گیا تھا۔ اللہ کے ان ولیوں کے مزاروں پر ہر وقت رونق رہتی ہے اور لوگ قرآن خوانی کرتے نظر آتے ہیں۔ دربار عالیہ سے باہر نکلے تو ان سب کا بہاولپور جانے کا پروگرام بن گیا۔ کیونکہ چینی کا آبائی علاقہ ہے میرا پروگرام لاہور واپسی کا تھا ان تینوں کی مرضی آگے جانے کی تھی۔ ان کے آگے میری کیا چلتی۔

بہاولپور والے دوستوں نے کھانے کا اصرار کیا مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ سلاہور واپسی کا سفر شروع ہوا تو ایک جگہ ہوٹل پر رات کا کھانا کھانے کے لیے رک گئے۔ بہاولپور والے دوست واپس چلے گئے۔ کھانے کے دوران انہوں نے ایک بار پھر میری مرضی پوچھی میں نے کہا ٹھیک ہے بہاولپور چلتے ہیں۔ جب میں نے اس سے پہلے کہا تھا تو مانے نہیں تھے۔ اس سے قبل اسی بات پر تھوڑی بدمزگی پیدا ہوئی۔ یہ اس کی فطرت میں شامل ہے۔ ملتان سے دس بجے رات بہاولپور کے لیے نکلے اور رات بارہ بجے ہارون کے گھر پہنچے۔ ان کے والد گرامی اور بھائیوں سے تعارف ہوا۔ کھانا کھایا چائے پی رات کے دو بج گئے تھے مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ تھکاوٹ تھی پھر بھی نیند نہ آئی۔ رات اسی طرح بیت گئی۔ صبح بستر چھوڑا تیار ہوا اور انہیں جگایا۔ ناشتہ تیار تھا۔ ناشتہ کے بعد قلعہ دیڑاور دیکھنے چل پڑے۔ یہ کوئی بہاولپور شہر سے دو گھنٹے کی مسافت پر ہے یہ روہی کا منظر بھی کیا منظر ہے۔ پورا چولستان اپنے اندر ایک خوبصورتی اور تاریخ سمیٹے ہوئے ہے۔ یہاں کے دن گرم اور راتیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔

پہلے تو چینی اور اویس ڈراتے رہے کہ وہاں شدید گرمی ہے آپ برداشت نہیں کر سکتے۔ پیاس انسان کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ وہاب کے پرزور اصرار پر انہیں جان پڑا۔ وہاں گئے تو موسم معمول پر تھا۔ کافی دیر قلع ڈیراور دیکھتے رہے۔ ان نوابوں اور معماروں کو داد دیتے رہے۔ مگر حکومتوں کی لاپرواہی کی وجہ سے یہ کھنڈر بنتا جا رہا ہے۔ اس کی دیوار اتنی چوڑی ہے جیسے دیوار چین مگر خستہ حالی کا شکار ہے۔ قلعہ کے اندر ایک تاریخی توپ کھڑی یاد رفتہ کی یاد دلا رہی تھی۔ یہاں تصاویر بنوائیں اور دوستوں نے سیلفیاں بنائیں۔

عالمی شہرت کا حامل قلعہ ڈیراور بہاولپور شہر سے 60 میل کے فاصلے پر موجود ہے یہ چولستان کا علاقہ ہے اس قلعہ کی تعمیر کے حوالے سے تاریخ خاموش ہے تاریخ دانوں نے اس کے تعمیر کنندوں کے کئی نام بتائے ہیں۔ اس طرح مختلف ادوار کے حوالے سے اس قلعہ کے بھی کئی نام سامنے آتے ہیں کسی نے اسے قلعہ ''دلاور'' کہا کسی نے ''دلاواہ'' اور کسی نے ''دراول'' رکھا ہے۔ اس قلعے کی تعمیر اور دریافت کے حوالے سے بھی کئی کہانیاں موجود ہیں۔ ایک روایت کے مطابق ایک جوگی نے اس مقام پر بہت سارا سونا اور چاندی بنا کر اسے محفوظ کرنے کے لیے اونچی اونچی دیواریں تعمیر کروائیں۔ جب سکندر اعظم یہاں پہنچا تو اس نے خزانہ تلاش کروانے کے لیے کافی کھدائی کروائی۔ مگر اسے خزانہ نہ ملا۔ اس کے بعد لوگ تلاش کرتے رہے مگر انہیں کامیابی نہ ملی۔ صحرا میں جگہوں اور ٹیلوں کو تلاش کرنا آسان نہیں ہوتا۔ ریت آئے دن اپنی شکل اور اونچائی بدلتی رہتی ہے۔

اس خزانے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جسے سکندر اعظم سمیت بہت سے لوگ تلاش نہیں کر پائے۔ یہ خزانہ ویر سدھو کے اونٹ نے اپنا پاؤں مار کر

تلاش کر لیا اور اس خزانے سے ویر سدھو نے اس مقام پر ایک قلعہ تعمیر کروایا جو بعد میں "ڈیراور" کے نام سے معروف ہوا۔ عباسیہ خاندان کے اول نواب صادق محمد خان نے 1726ء اسے فتح کیا تو اس وقت اس قلعے کا نام ڈیراور ہی تھا۔ اس وقت قلعہ مضبوط اور پختہ تھا۔ قلعہ کے گرد خاصی آبادی موجود تھی۔ قلعہ کی حفاظت کے لیے قلعہ سے پہلے ایک حفاظتی دیوار موجود تھی۔ اس دیوار کے آثار ختم ہو چکے ہیں۔

باہر سے کچھ بہتر نظر آنے والا قلعہ اندر سے اکیلے انسان کی طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ اس کے اندر ایک جیل ہوا کرتی تھی۔ اس کے کمروں اور لوہے کی سلاخوں کے دروازے اب بھی موجود ہیں۔ سارے کمرے خستہ حالی کا شکار ہو چکے ہیں۔ اس کے قریب ہی ایک تاریخی مسجد بھی ہے جو بند پڑی ہے۔ صدیوں پہلے جب بجلی تھی نہ سپیکر۔ اس کے محراب اس انداز سے بنائے گئے تھے کہ جب موذن اذان دیتا تھا تو اس کی آواز بغیر سپیکر کے پورے ایریا میں گونجتی تھی۔ نواب بہاولپور کا آبائی قبرستان کے گیٹ پر بھی تالا پڑا تھا۔ قلعہ کے ویران کمروں اور برآمدوں میں ہزاروں کی تعداد میں دیواروں اور چھتوں سے چمگادڑ چمٹے ہوئے ہیں۔ اس قلعہ کو دیکھ کر معلومات میں اضافہ ہوا ان اضافی معلومات اور یادوں کو سمیٹتے ہوئے ہم نے واپس بہاولپور کی راہ لی۔

سہ پہر کو گھر واپس آئے چینی کے گھر کھانا کھایا۔ ان کے والد گرامی سے ہمیں آتے ہوئے بہاولپور کی سوغات سوہن حلوہ دیا۔ ہم نے ان کی صحبت اور مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا ان کے والد بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ انہیں تاریخ سے بڑا لگاؤ ہے۔ گھر سے نکلے تو رات میں سرجیکل مارکیٹ میں عبدالوہاب نے کچھ دکانداروں سے اپنے کاروبار کے بارے میں ملنا تھا۔ وہاں سے فارغ ہوئے تو راستے میں نور محل آ گیا۔ یہاں ٹکٹ 75 روپے فی کس ہے۔ یہ نور محل بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اسے بنے کوئی ڈیڑھ صدی ہو گئی۔ اب یہ فوج کی نگرانی میں ہے۔

پشاور سے کراچی جانے والی ریلوے لائن کے قریب واقع بہاولپور پاکستان کا بارھواں بڑا قدیمی شہر ہے۔ یہ دریائے ستلج کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ اس شہر میں یہ تاریخی عمارت "نور محل" جلوہ افروز ہے۔ 1872ء میں ریاست بہاولپور والی سر صادق محمد خان عباسی نے رہائش کے لیے بستی ملوک شاہ میں ایک شاندار محل تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ سر صادق محمد خان عباسی یہ محل اپنی ملکہ عالیہ کے لیے یادگار کے طور پر بنوانا چاہتے تھے۔ عباسی حکمرانوں کے "شاہ میاں" سر صادق محمد خان عباسی نے جب نور محل کی تعمیر کا ارادہ کیا تو اس وقت کے معروف معمار دربار شاہی بھی اکٹھے کیے۔ نور محل کا نقشہ ریاست کے سرکاری انجینئر "ہیسن" نے تیار کیا اور اسی کی نگرانی میں 1872ء میں محل کی تعمیر شروع کی گئی۔ محل کا نقشہ تیار ہوتے ہی بلا تاخیر اس کی بنیادیں کھدوائی گئیں۔ ان میں شہر کا نقشہ چند دعائیں اور بہت سے سکے ڈال کر تعمیر شروع کر دی گئی۔

1875ء کو نور محل کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اس دلکش تاریخی محل کو محض چار سال کے مختصر مرحلے میں مکمل کر لیا گیا۔ محل کیا تھا لق ودق صحرا میں طلسماتی کا ٹکڑا تھا۔ نور محل 152 ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس عالی شان محل کی تعمیر پر اس وقت 12 لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے۔ تعمیر کے لحاظ سے یہ محل اس وقت ہندوستان میں ایک نادر شاہکار عمارت تصور کی جاتی ہے۔ اسلامی اور اطالوی نئی تعمیر کے شاہکار نمونے نور محل کے حوالے سے بہت سی کہانیاں مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ نواب صادق محمد خان چہارم نے بڑے شوق اور لگن سے یہ محل اپنی ملکہ کے لیے بنوایا تھا۔ مگر ملکہ کو یہ محل پسند نہ آیا۔ ملکہ نے صرف یہاں ایک رات قیام کیا۔ محل مکمل ہوا شاہی خاندان کی تشریف آوری ہوئی ملکہ نے محل کا ایک ایک کمرہ دیکھا چاندنی رات تھی۔ ملکہ محل کی بالائی منزل پر آئی اور بالکونی سے باہر کا نظارہ کرنے لگی محل کے باہر ایک وسیع لان ہے۔ بالکونی میں کھڑی ملکہ کی نظر اچانک قبرستان ملوک شاہ کی طرف چلی گئی ملکہ یہ منظر دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی اس کے چہرے پر عجیب سی افسردگی طاری تھی۔ وہ اپنی خواب گاہ میں واپس آ گئی اور سر صادق محمد خان کو آگاہ کر دیا کہ اس محل میں مزید نہیں رہ سکتی ملکہ ایک رات قیام کے بعد واپس چلی گئی۔ یہ نور محل ایک عرصہ تک بند رہا۔ عباسیوں کا دور ختم ہوا، ریاست بہاولپور پاکستان میں ضم ہو گئی۔ نور محل محکمہ اوقاف میں آ گیا۔ چند برس بعد محکمہ اوقاف سے پاک فوج کی تحویل میں آ گیا۔ پاک فوس نے عباسی عہد کی اس تاریخ کو نیا رنگ و روپ دیا۔

دیواروں پر تمام نوابوں کی قد آور بڑی بڑی پینٹ کی ہوئی تصاویر آویزاں ہیں۔ یہاں بھی ہم سب نے تصاویر بنائیں۔ عبدالوہاب ویڈیو بناتا رہا۔ یہ نور محل بھی اپنے اندر ایک تاریخ سمیٹے نظر آتا ہے۔ خاص طور پر رات کا منظر خوب ہوتا ہے۔ یہاں ہم نے میزبانوں سے اجازت لی اور گاڑی لاہور کی جانب ڈال دی۔ یہ سفر بھی عجیب سفر تھا۔ کچھ یاد رہا کچھ بھول گیا۔ ہم وہاں سے رات نو بجے روانہ ہوئے اور دوسرے دن علی الصبح پانچ بجے لاہور پہنچے اور اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔

انٹرویو نیلما ناہید درّانی

سب سے پہلے اپنے ادبی وسوانحی پس منظر سے آگاہی دیجئے

عملی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟

ادب سے شوق کی ابتدا؟

میں لاہور میں پیدا ہوئی۔۔۔امی کا خاندان لاہور میں برانڈرتھ روڈ پر رہتا تھا۔۔امی کے دادا حکیم محمد ذکریا انجمن حمایت اسلام طبیہ کالج کے پرنسپل تھے۔۔۔امی کے والدین ان کے بچپن میں وفات پا گئے تھے ان کی پرورش ان کے دادا اور دادا کے بعد ان کے چچا نے کی تھی۔۔۔شادی بھی چچا نے کروائی۔۔۔

میرے والد کا خاندان امرتسر سے لاہور آیا تھا۔۔پاکستان بننے کے بعد۔۔۔

میرے دادا مولانا آغا نعمت اللہ جان درانی۔۔۔خطیب اہلبیت تھے ان کا تخلص احقر امرتسری تھا۔۔۔ان کی کتابیں چھپ کر گھر میں آتی تھیں۔۔

''شان عزا'' اور ''یاد حسینؑ'' ان کی دو کتابوں کے نام ہیں۔۔۔

میرے والد آغا اعجاز حسین درانی کو شاعری، افسانہ نگاری اور مصوری سے لگاؤ تھا۔۔۔امرتسر میں اے حمید اور سیف الدین سیف سے دوستی تھی۔۔۔وہ گفتگو کے دوران اقبال، غالب کے اشعار پڑھا کرتے جو بچپن میں ہی ہمارے ذہنوں میں محفوظ ہو گئے تھے۔گھر میں کتابوں کی فراوانی تھی۔۔۔بہت سارے رسائل بھی آتے تھے۔ہمیں ہر ماہ بچوں کی دنیا، تعلیم و تربیت، ہدایت لے کر دیے جاتے۔۔۔ان دنوں گلی محلوں میں آنا لائبریری بھی ہوتی تھی۔۔ہم وہاں سے لا کر بھی کتابیں پڑھتے۔۔۔یوں والد اور دادا نے ہمیں مطالعہ کرنے کے ساتھ لکھنے کی ترغیب بھی دی۔۔۔۔پہلی کہانی ماہنامہ ہدایت میں چھپی جب میں چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی۔۔۔رسالہ کے ایڈیٹر جناب نظر زیدی تھے۔۔۔پہلی نظم 1965 کی جنگ کے بارے میں لکھی۔۔۔

پہلا مشاعرہ۔۔۔ریڈیو پاکستان لاہور کے ہفتہ اطفال کے مشاعرے میں پڑھا۔۔جس کی صدارت صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نے کی۔۔۔پروگرام کے پروڈیوسر بشیر زیدی اسیر تھے۔۔۔۔

پہلا بڑا مشاعرہ سکول کے زمانے میں ہی ایمبسڈر ہوٹل لاہور میں پڑھا جس کا اہتمام مشیر کاظمی نے کیا تھا۔۔۔۔صدارت پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر علامہ علاؤالدین صدیقی کی تھی

اپنی تصانیف کے بارے میں بتایئے؟

میری پہلی کتاب 1986 میں شائع ہوئی۔۔۔''جب تک آنکھیں زندہ ہیں''

2۔۔جب نہر کنارے شام ڈھلی۔

3۔تمہارا شہر کیسا ہے

4۔۔واپسی کا سفر

5۔۔قطرہ قطرہ عشق

6۔۔چانن کتھے ہویا۔پنجابی شاعری

7۔۔دکھ سجا ایہ جگ۔پنجابی شاعری

8۔۔اداس لوگوں سے پیار کرنا۔۔

9۔۔راستے میں گلاب رکھے ہیں۔۔

10۔۔جنگل، جھیل اور میں

11۔۔چڑھدے سورج دی دھرتی۔۔سفرنامہ جاپان

12۔۔چاند، چاندنی، چندی گڑھ۔۔۔سفر نامہ بھارت

13۔۔ٹھنڈی عورت۔۔افسانے

14۔۔بلجیم میں بیس دن۔۔افسانے

15۔۔عقیدت (نعت، سلام، مرثیہ)

سوال نمبر 5: آپ نثر نگار بھی ہیں۔شاعر بھی۔۔۔شاعری زیادہ مرغوب ہے یا نثر؟

مجھے اچھی تحریر پڑھنا اور لکھنا مرغوب ہے۔خواہ وہ شاعری کی صورت میں ہو یا نثر میں۔۔۔۔شاعری مصوری، مجسمہ سازی، کہانی کاری یہ سب فنون لطیفہ کی مختلف اقسام ہیں۔۔۔افکار کے بہتے ہوئے دھارے کو جو بھی اظہار یہ ممکن ہو وہ اس میں ڈھل جاتا ہے۔۔۔مجھے شعر کہنا اس لیے پسند ہے کہ کم الفاظ میں بڑا موضوع بھی ایک شعر میں بیان کیا جا سکتا ہے۔۔۔شاعری کے لیے وقت جگہ کی پابندی بھی نہیں ہوتی۔۔۔جبکہ نثر لکھنے کے لئے جگہ اور زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔۔۔شاعری میں اثر آفرینی بھی زیادہ ہے۔۔۔اسے ساز اور آواز کے ذریعے عوام تک پہنچایا جا سکتا ہے

الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جا رہا ہے؟؟

الیکٹرک میڈیا ہی صرف کتاب سے دوری کی

وجہ نہیں ہے۔۔۔۔کتاب کا مہنگا ہونا اور عام ادمی کی دسترس سے باہر ہونا بھی ایک وجہ ہے۔۔۔جن ممالک نے الیکٹرک میڈیا کی بنیاد رکھی وہ تو کتاب پڑھتے ہیں۔۔۔ہر محلے میں لائبریری موجود ہے۔۔۔جہاں ہر عمر کے لوگوں کے لیے الگ الگ سیکشن ہیں۔۔۔خاص طور پر بچوں کے حصے کو بچوں کے لیے پرکشش بنایا جاتا ہے۔۔بچوں کی ممبر شپ بھی ہوتی ہے۔۔۔وہ کتابیں گھر بھی لے جا سکتے ہیں۔۔۔اگر پاکستان میں بھی اس طرح لائبریریاں ہوں تو کتاب سے دوری ختم ہو سکتی ہے۔۔۔۔

پبلشرز نے بھی رنگین سرورق والی مہنگے کاغذ پر کتاب چھاپ کر اسے عوام سے دور کر دیا ہے۔۔۔منٹو، کرشن چندر۔ راجندر سنگھ۔۔منشی پریم چند اور جتنا بھی ادب ہم نے پڑھا وہ نیوز پرنٹ پر چھپی ہوئی۔۔پیپر بیک جلد والی نہایت سستی کتابیں ہوتی تھیں۔۔۔اب کتاب صرف دیکھنے یا شیلف میں سجانے کی چیز بن گئی ہے

تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

تخلیق وہ واردات ہے جو کسی حساس انسان کے ذہن و دل پر اس کے اردگرد ہونے والے واقعات۔حادثات اور اثرات کے نتیجے میں اس کے قلم سے وجود میں آتی ہے۔۔۔دنیا میں آنے والا ہر انسان اپنے اردگرد کے حالات۔موسم۔زندگی کی خوشیوں۔غموں۔۔سیاسی اور جغرافیائی تبدیلیوں سے متاثر ہوتا ہے۔۔۔مگر ایک فنکار کا قلم۔۔اس کا برش ان لمحوں کو اپنے لفظوں یا رنگوں میں قید کر لیتا ہے۔۔۔اس کو تخلیق کہا جاتا ہے۔۔۔

اچھا تخلیق کار وہ ہی ہے جس میں کوئی انفرادیت ہو۔۔۔وہ اپنی الگ ڈکشن لے کر اپنی الگ پہچان بنا سکے

10: کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

ہنسی کے ساتھ ہی آنکھوں میں آ گئے آنسو
خوشی کے ساتھ یہ غم کا حصار کیسا تھا۔۔۔

سوال 11: مشاعروں پر جو زوال آیا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ آج کل مشاعروں کے نام پر جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

کچھ عرصہ سے محسوس ہو رہا ہے کہ ہر شعبہ میں غیر سنجیدگی کی فضا ہے۔۔۔۔کچھ لوگ فیشن کے طور پر اس شعبہ میں آ گئے ہیں۔۔۔ان کا نظریہ شہرت حاصل کرنا ہے۔۔۔کچھ گروہ بندیاں ہیں۔۔۔اصل فن کی پہچان ختم ہو گئی ہے۔۔۔نیا منظر نامہ عجیب سا ہو گیا ہے۔۔۔لیکن کہیں کہیں کبھی کبھار بہت سنجیدہ مشاعرے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔۔۔۔جیسے میاں چنوں میں آپ کے زیر اہتمام ہونے والا مشاعرہ ایک یادگار مشاعرہ تھا جو فجر کی اذان تک جاری رہا اور ہزاروں کی تعداد میں سامعین نے شرکت کی۔ معیاری اور خوبصورت شاعری پیش کی گئی۔۔۔ایسے مشاعرے اب خال خال ہی دیکھنے سننے کو ملتے ہیں

سوال نمبر 12: کسی شاعر یا ادیب کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ معاشرے سے؟ یا اندرون سے؟

دونوں سے۔۔۔۔شاعر اور ادیب اپنے قلبی، باطنی اور بیرونی۔موسمی، معاشی، معاشرتی، سیاسی، ناگہانی واقعات سے تحریک لیتا ہے اور ان کو اپنی تحریر میں ڈھالتا ہے

سوال نمبر 13: آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کیسے دیکھتے ہیں؟

سوشل میڈیا ایک اچھا ذریعہ ہے۔۔ادب کے فروغ کے لیئے۔۔۔اس کی وجہ سے ہم اپنی بات اپنی تحریر اپنی تخلیق دنیا کے ہر کونے میں موجود لوگوں تک پہنچا سکتے ہیں۔۔۔۔لیکن یہاں بھی کچھ غیر سنجیدہ لوگ۔۔۔اقبال یا مختلف اساتذہ کے نام سے منسوب بے وزن اور بے تکے اشعار پوسٹ کر رہے ہیں۔۔۔جو ادب کی بجائے بے ادبی پھیلا رہے ہیں۔۔۔ادبی سرقہ بھی بڑھ گیا ہے۔۔۔کچھ لوگ اصل شاعر کے نام کی بجائے۔۔۔کسی کی بھی شاعری لگا کر داد وصول کرتے ہیں۔۔۔جب انہیں احساس دلایا جائے تب بھی شرمندہ نہیں ہوتے

سوال نمبر 14: ذاتی تجربات و مشاہدات ایک فنکار کی تخلیقات پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں؟

تخلیق کار کی ہر تخلیق اس کے ذاتی تجربات مشاہدات، محسوسات اور واقعات ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔۔اس میں زیب داستاں کے لیے رنگ بھرے جا سکتے ہیں کچھ تصوراتی کردار اور واقعات بھی گھڑے جاتے ہیں۔۔۔لیکن ہر تخلیق اپنے خالق کے تجربات و مشاہدات کا ہی مظہر ہوتی ہے

سوال 15: کیا کھویا کیا پایا؟

یہ بڑا دلچسپ سوال ہے۔۔۔۔کیا کھویا کیا پایا؟۔۔۔میں نے زندگی کے ہر لمحے سے، ہر انسان سے، ہر واقعہ سے کچھ نا کچھ سیکھا ہے۔۔۔کسی دکھ نے مجھے شعر دیا ہے۔۔۔کسی واقعہ نے کہانی۔۔۔لہذا میں نے کبھی کچھ کھویا نہیں ہمیشہ پایا ہی ہے۔۔۔

انٹرویو محمد سلیم ساگر

سوال نمبر 1۔ اپنی ابتدائی زندگی کے متعلق کچھ بتایئے؟
جواب۔میری پیدائش 19 اکتوبر 1973 کاموکی ضلع گوجرانوالہ کی ہے۔جہاں عمر عزیز کے ابتدائی چند سال گزارے۔

سوال نمبر 2۔ تعلیم اور ملازمت کے بارے میں کچھ بتایئے؟

جواب۔ والدین نے پرائمری تعلیم کیلئے مجھے آرمی برن ہال سکول و کالج ایبٹ آباد بھجوادیا جہاں سے میں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی اس کے بعد ایف سی کالج لاہور سے انٹرمیڈیٹ اور انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور سے مکینیکل انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ انجینئرنگ کے فوری بعد میں نے مقابلے کا امتحان (پنجاب سول سروس) پاس کیا اور بطور سیکشن آفیسر تعیناتی ہوئی۔ اس وقت میں بطور ڈپٹی سیکرٹری ٹو گورنمنٹ آف دی پنجاب اپنے فرائض منصبی سر انجام دے رہا ہوں۔

سوال نمبر 3۔ شاعری کی طرف رُجحان کیسے ہوا؟
جواب۔شاعری سکول کے زمانے سے ہی میرے اندر رچی بسی تھی بہت سے اشعار ایک دفعہ سننے یا پڑھنے سے ہی یاد ہوجاتے تھے۔درجہ ہفتم میں، میں نے پہلاشعر کہا جو درج ذیل ہے۔

ہم تیری محبت میں کس موڑ پہ آ پہنچے
جینا بھی جہاں مشکل مرنا بھی جہاں مشکل

میر، غالب اور اقبال کے لاتعداد اشعار مجھے اسی دور میں یاد تھے۔

سوال نمبر 4۔ کیا ابتداء میں گھر والوں کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑایا پزیرائی کی گئی؟
جواب۔میری شاعری کا باقاعدہ علم گھر والوں کو تب ہوا جب میری پہلی کتاب شائع ہو کر اُن کے ہاتھوں میں آئی۔میرے والد صاحب نے خوش ہو کر مجھے انعام بھی دیا اور بہن بھائیوں نے بھی بہت پذیرائی کی البتہ عزیز و اقارب کی طرف سے دبی دبی مخالفت کے ساتھ ساتھ مذاق اور طنز و تشنیع کا نشانہ بنایا گیا۔

سوال نمبر 5۔ کیا آپ کے شہر میں ادبی ماحول تھا یا لاہور آکر شعری ذوق پروان چڑھا؟
جواب۔ ہمارے شہر میں ادبی ماحول ضرور تھا مگر میں اپنے شہر میں بہت زیادہ وقت کیلئے رہا نہیں۔جیسا کہ پہلے اوپر عرض کر چکا ہوں کہ میں ابتدائی تعلیم کیلئے ہی ایبٹ آباد چلا گیا تھا۔البتہ ہمارے شہر کی ایک شخصیت جناب حنیف نازش صاحب جو کہ خود ایک قادرالکلام شاعر ہیں انہیں اپنی ابتدائی غزلیں اکثر و بیشتر دکھایا کرتا تھا۔علاوہ ازیں اس بات کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ باقاعدہ شعر کہنے اور شعری ذوق کی ترویج میں انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور کی لٹریری سوسائٹی کا بڑا عمل دخل ہے۔اس سوسائٹی میں قابلِ ذکر اور قابلِ قدر نام محترم رحمان حفیظ صاحب کا ہے۔

سوال نمبر 6۔ ابتداء میں کن شعراء سے متاثر تھے اور شروع میں کن ادبی کُتب کا مطالعہ کیا؟
جواب۔جیسا کہ اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ ابتدائی طور پر کورس کی کتابوں سے میر، غالب اور اقبال بہت دل کو بھائے اور اُس کے بعد شکیب جلالی احمد فراز، فیض احمد فیض، مجید امجد اور منیر نیازی کا مطالعہ کیا۔عصرِ حاضر کے نوجوان شعراء میں سے جناب اختر عثمان کی شاعری نے بہت متاثر کیا۔

سوال نمبر 7۔ پہلے شعری مجموعے کی اشاعت کب ہوئی اور اس کے حوالے سے جو آپ نے خواب دیکھے تھے کیا اُن کی تعبیر ملی؟
جواب۔پہلا شعری مجموعہ دھوپ دھنک کے نام سے 1998 میں شائع ہوا جب میں جامعہ ہندسیہ لاہور کا طالب علم تھا۔ابتدائی طور پر پہلے مجموعے کی ترسیل صرف جامعہ تک ہی محدود رہی اور طلبہ و طالبات نے بہت پذیرائی کی۔

سوال نمبر 8۔ غزل سے نظم کی طرف رُجحان کیسے ہوا۔ کس صنف میں سہولت کے ساتھ اظہار کر پاتے ہیں؟
جواب۔میری ناقص رائے میں غزل اور نظم دونوں ہی اپنا جداگانہ رنگ، اپنا الگ کینوس اور اپنا مختلف لطف رکھتی ہیں۔البتہ جو لطف اور رنگ اردو غزل کا ہے وہ نظم کی جملہ اقسام میں سے کسی میں بھی نہیں ملتا۔نظم بہت کم کہی یا یوں کہیے کہ جب خیال دو مصرعوں کے سپرد نہ ہوسکا تو نظم کے کینوس کا سہارا لیا۔

سوال نمبر 9۔ آپ مشاعروں اور ادبی تقریبات میں بہت کم شرکت کرتے ہیں اس کی وجہ معروفیت ہے یا کوئی اور؟
جواب۔یہ بات درست نہیں ہے اگر سوال میں یوں کہا جاتا کہ اب میری شرکت کم ہوگئی تو درست ہوتا۔

آپ جانتے ہیں کہ لاہور کے ادبی حلقوں اور ادبی سرگرمیوں میں 2000 کی دہائی میں میری شمولیت یقینی ہوتی تھی۔ لیکن اب معاصرین کے رویوں اور ریشہ دوانیوں سے ادبی تقریبات کو تقریباً خدا حافظ کہہ چکا ہوں۔

سوال نمبر 10۔ افسری کی راہ میں شاعری یا شاعری کی راہ میں افسری تو حائل نہیں ہوتی؟

جواب۔ اس کے جواب میں مصطفیٰ زیدی کا ایک شعر عرض کرتا ہوں۔

شاعروں میں افسر ہوں
افسروں میں شاعر ہوں

سوال نمبر 11۔ آپ کی شاعری کا نظریہ کیا ہے؟

جواب۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے نظریات پر بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ البتہ میرے لئے شاعری ایک سنجیدہ ذریعہ اظہار اور اپنے ذوق کی تسکین کا سبب ہے۔

سوال نمبر 12۔ شاعری کے علاوہ کس صنف میں لکھتے ہیں یا لکھنا چاہتے ہیں؟

جواب۔ ابتداء میں افسانہ بھی لکھا اور مضامین بھی لیکن جو لطف غزل کہنے کا ہے وہ کسی اور صنف میں نہیں ملا۔

سوال نمبر 13۔ کیا آپ اُردو ادب کو بین الاقوامی ادب کے معیار سے ہم آہنگ پاتے ہیں؟

جواب۔ ہم آہنگ تو ہے مگر ابھی اردو ادب نے بہت سا سفر طے کرنا ہے۔

سوال نمبر 14۔ مشاعروں اور ادبی گروہ بندیوں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب۔ گروہ بندیوں سے تخلیق کے عمل کو نقصان پہنچتا ہے۔

سوال نمبر 15۔ کیا بہتر تخلیق کیلئے تنقیدی معیارات کا علم اور روایت کا مطالعہ ضروری ہے؟

جواب۔ میری ناقص رائے میں تخلیق کا جوہر مطالعہ اور تنقید سے نکھر جاتا ہے۔

سوال نمبر 16۔ آخر میں ارژنگ کے قارئین کے لئے کوئی پیغام اور منتخب کلام سے نوازیں۔

جواب۔ "میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے"

منتخب کلام

سبک رفتار لمحوں کی حدیں ترتیب دیتا ہوں
سحر کے سانس گنتا ہوں شبیں ترتیب دیتا ہوں
مرے لوگوں کی فطرت میں یزیدی وصف شامل ہے
وہی مجھ کو مٹاتے ہیں جنہیں ترتیب دیتا ہوں
خزاں نے خشک پتوں میں صدائیں بانٹ رکھی ہیں
میں ان کی سرسراہٹ سے دُھنیں ترتیب دیتا ہوں
تجھے سوچوں تو پہلو سے سرک جاتا ہے میرا دل
سو دل پر ہاتھ رکھ کر دھڑکنیں ترتیب دیتا ہوں
میں آبِ زر سے لکھتا ہوں تمہارا نام شعروں میں
سنہرے حرف بنتا ہوں تمہیں ترتیب دیتا ہوں

....

آئینہ مجھے یاد دلاتا ہے کہ میں ہوں
ورنہ تو مجھے بھول ہی جاتا ہے کہ میں ہوں
وہ ہونے نہ ہونے کا تذبذب ہے کہ ہر شخص
بے وجہ پکارے چلا جاتا ہے کہ میں ہوں
میں نیند میں جا جا کے بھلاتا ہوں اُسے اور
وہ خواب میں آ آ کے بتاتا ہے کہ میں ہوں
جھگڑا تو یقیں آنے نہ آنے کا ہے اے دوست
ورنہ مجھے خود بھی نظر آتا ہے کہ میں ہوں
میں جب بھی مصیبت میں پکاروں کہ کوئی ہے؟
آوازہ سا افلاک سے آتا ہے کہ میں ہوں

ظفر اعوان/ڈنمارک

تہتیں اپنے نام کرتا ہوں
بس یہی ایک کام کرتا ہوں
یہ محبت بہت ہی مشکل ہے
اب کوئی اور کام کرتا ہوں
دوست سر پر بٹھاتا ہوں اپنے
دشمنوں کو غلام کرتا ہوں
اس نے آنا کبھی نہیں ہوتا
پھر بھی میں اہتمام کرتا ہوں
کچھ پرندے اسے بتاتے ہیں
پیڑ سے لگ کے شام کرتا ہوں
عام کو خاص میں بناتا ہوں
خاص لوگوں کو عام کرتا ہوں
کرتا ہوں ذات کی نفی ہر پل
بات اپنی تمام کرتا ہوں

گل فراز/ہڈالی

ایک بے کار سی بات پر ڈٹ گیا
تھوڑا بھی پھر نہیں، سر بہ سر ڈٹ گیا
چھوڑ کر جانے ہی والا تھا میں کہیں
اس کو آتا ہوا دیکھ کر ڈٹ گیا
ہجر طوفان حالانکہ آیا نہیں
میں سمجھدار تھا پیش تر ڈٹ گیا
خوف آتا تھا اس کام کا سوچ کر
کرنے پر آیا تو بے خطر ڈٹ گیا
بند رکھتا تو محفوظ رہتا، مگر
بوکھلاہٹ میں در کھول کر ڈٹ گیا
جبکہ باہر نکلنا مناسب نہیں
میں یونہی تو نہیں اپنے گھر ڈٹ گیا
سوچ کر بولنا ہے وہاں گل فراز
پیچھے ہٹتا نہیں وہ اگر ڈٹ گیا

انہیں اپنے چولستانی ہونے پر فخر ہے۔

روحانیت پوری سائنس ہے، اور انسان کا لطیف ہونا ایک آرٹ ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ ادبی مراکز کی ہیئت اور نوعیت تبدیل ہوئی ہے۔

ادبی گروہ بندیاں ہی سب سے بڑی بے ادبی ہے۔

ڈائجسٹ کی اہمیت سے انکار ادبی تعصبانہ رویہ ہے۔

کہانی وہ اہم ترین ذریعہ ہے جس سے ہم اپنی اگلی نسل کو علم و حکمت اور دانش کا ورثہ منتقل کرتے ہیں۔

کوئی تو ایسا ادارہ ہو، جو کسی کتاب کی ادبی حیثیت و مقام کا تعین کرے۔

کتاب سے جڑا ہوا رشتہ قوموں کو اوج کمال تک پہنچاتا ہے۔

ناول نگار جناب امجد جاوید سے آصف نیاز کا مکالمہ

کوئی بھی تخلیق کار جب اپنی تخلیق کاری میں، اپنی مٹی کی مہک شامل کرتا ہے تو اس کا یہ عمل اپنی دھرتی سے محبت کا بیّن ثبوت ہوتا ہے۔ یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ وہ اپنی دھرتی پر مضبوطی سے کھڑا ہو کر تخیل کے آسمان و زمین کی وسعتوں میں جھانک رہا ہے اور اپنے مرکز سے جڑا ہوا ہے۔ امجد جاوید ایک ایسے ہی تخلیق کار ہیں۔ انہیں اپنے چولستانی ہونے پر نہ صرف فخر ہے بلکہ وہ اپنی تخلیق کاری میں صحرا اور اس سے جڑے ہوئے استعارے اور علامتیں بھرپور انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے روہی ان کے اندر بس چکی ہے اور وہ چولستان کی وسعتوں میں کہیں کھو گئے ہیں۔ روہی کا ذکر ہو اور خواجہ غلام فرید سرکارؒ کا تذکرہ نہ ہو، یہ ممکن نہیں ہے۔ امجد جاوید اپنے اظہار میں جا بجا خواجہ غلام فرید سرکارؒ ہی کا حوالہ دیتے ہیں۔ جس طرح حضرت اقبالؒ صحرا میں لالہ فام کھلنے کی بابت فرماتے ہیں، بالکل اسی طرح امجد جاوید بھی ادبی مراکز سے دور، جنوبی پنجاب میں ناول نگاری کرتے چلے جا رہے ہیں۔ جیسے کوئی درویش کسی ٹیلے پر جنڈ کے درخت تلے اپنے ہی گیان دھیان میں مگن بیٹھا ہو۔ اس کی تخلیق کاری کو کون کس طرح لیتا ہے، کس طرح دیکھتا اور پرکھتا ہے، وہ اس معاملے میں بے نیاز ہے اور بس لکھتا چلا جا رہا ہے۔ اب تک ان کے لکھے ہوناولوں کی تعداد اٹھارہ ہو گئی ہوئی ہے۔ جن میں عشق کا قاف، فیض عشق، امرت کور، کیمپس، سائبان سورج کا، دھوپ کے پگھلنے تک۔ جب عشق سمندر اُوڑھ لیا، ذات کا قرض، قابل ذکر ہیں۔ ان کے آخری ناول "قلندر ذات" کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں، اور ان کا تازہ ناول، "بے رنگ پیا" ہے۔ امجد جاوید نے لکھنے کا آغاز ۱۹۸۸ء میں ایک کہانی لکھ کر کیا، جو ایک ڈائجسٹ رسالہ میں شائع ہوئی، پھر اس کے بعد بقول خالد بن حامد، "انہوں نے آنکھ نہیں جھپکی۔" وہ مسلسل لکھتے چلے جا رہی ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں انہیں اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور سے ابلاغیات میں ماسٹر کیا۔ یہاں انہیں سجاد پراچہ، ریحان ساجد، واجد خان اور شبیر بلوچ جیسے اساتذہ ملے۔ عملی زندگی کا آغاز روزنامہ جنگ لاہور کیا۔ کہانی کے ساتھ ساتھ صحافتی لکھت بھی ان کی ہم سفر ہوئیں۔ مضامین، فیچر، انٹرویو، ان کے کریڈٹ پر آتے چلے گئے۔ روزنامہ جنگ میں انہیں سب سے زیادہ عابد مسعود تہامی، عبدالرحمٰن جامی سے سیکھنے کا موقعہ ملا۔ انہوں نے شروع شروع میں شاعری بھی کی لیکن جلد ہی وہ نثر ہی کے ہو کر رہ گئے۔ دو ٹی وی سیریل، سکھاں اور پہچان ان نے لکھے پھر شاید اس دشت کا سفر ترک کر دیا۔ ادیب، شاعر، ڈرامہ نگار اور ناول نگار جناب امجد جاوید سے گفتگو ہوئی، اس کا احوال پیش خدمت ہے۔

☆ آپ کی ناول نگاری کا اہم ترین موضوع عشق اور تصوف ہے، ان ہی موضوعات پر لکھنے کی کوئی خاص وجہ؟

◄ اصل میں انسان کی جمالیات کیا ہے؟ رب تعالی نے جس احسن تقویم پر انسان کو پیدا کیا ہے، وہ کیا ہے، اس کا ظہور کیا ہے اور کیسے ممکن ہے؟ اسے ظاہر کرنے والی صرف ایک قوت ہے اور وہ عشق ہے۔ یہ قوت عشق ہی ہے جو ناممکن کو ممکن کر دکھاتا ہے۔ اس بحث سے قطع نظر کہ عشق مجازی کیا ہے اور عشق حقیقی کیا ہے۔ عشق ایک قوت ہے، جو انسان کے اندر کا ظہور دیتی ہے۔ تصوف بزرگوں کا بتایا ہوا ایسا طریقہ ہے، جس سے انسان، انسانیت کے درجے پر فائز ہونے کی کوشش کے لئے اس طریقے کو زادِ راہ کے طور پر اپناتا ہے۔ یہ مسلسل عمل ہے، اور اس کے درجات ہیں۔ روحانیت باتوں سے نہیں آتی۔ یہ ریاضت ہے۔ روحانیت پوری سائنس ہے اور انسان کا لطیف ہونا ایک آرٹ ہے۔ فنا فی اللہ وہی سمجھ سکے گا جو اس سائنس کو سمجھتا ہو اور اس کے مطابق اس ریاضت سے گذرا ہو۔ چونکہ میں بھی عشق اور تصوف کو سمجھنے کی کوشش میں ہوں، اس کا ایک طالب علم ہوں اور ابھی تک نوآموز ہوں۔ اس لئے یہ میرا پسندیدہ موضوع بن گیا۔ میں نے صرف انہی موضوعات پر نہیں لکھا، بلکہ میرے دوسرے موضوع بھی ہیں۔ میں ان پر بھی لکھتا ہوں۔

☆ ادبی مراکز سے دور، مضافات میں بیٹھ کر تخلیق کاری میں کوئی مشکلات بھی ہوتی ہیں؟

◄ ظاہر ہے، کسی بھی شے کا کوئی مرکز تو ہوتا ہے۔ بنا مرکز کے تو وہ قائم ہی نہیں رہ سکتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ادبی مراکز کی ہیت اور نوعیت تبدیل ہوئی ہے۔ اور اس تبدیلی کی سب سے بڑی وجہ ذرائع رسل و رسائل ہیں، اب مضافات، وہ پہلے والا مضافات نہیں رہا، اور نہ پہلے والے ادبی مرکز رہے ہیں، ان کی نوعیت اور ہیت بدل گئی ہے۔ اصل شے یہ ہے کہ تخلیق کار، کیا تخلیق کر رہا ہے۔ لمحوں میں ان کی تخلیق ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکتی ہے۔ ہمارے ہاں ایسی خواتین بھی لکھ رہی ہیں، جنہوں نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا، مگر رب تعالی نے انہیں بے پناہ عزت سے نوازا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی بھی اچھی تخلیق تک اب قارئین کی رسائی ہے اور اسی طرح تخلیق کار کو بھی اپنے قارئین میسر ہیں۔ ادبی مراکز کی اب وہ پہلے والی اہمیت نہیں رہی۔

☆ لیکن دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ انہی ادبی مراکز میں ادبی تنظیمیں موجود ہیں۔ ایسی کوئی تنظیمیں مضافات میں موجود نہیں۔

◄ ادبی مراکز میں جو بھی ادبی تنظیمیں ہیں، بلاشبہ وہ بہت اچھا کام کر رہی ہوں گی۔ ظاہر ہے ہر تنظیم اپنے ہی ارکان کو آگے لانے میں دلچسپی رکھتی ہوں گی۔ سوال یہ کہ کیا ان ادبی تنظیموں کے باعث ادبی خدمت کیسی ہو رہی ہے؟ آیا جو ہمارے اس وقت کے معاشرتی چیلنجز ہیں۔ ان سے ہمارا تخلیق کار ان سے عہدہ براہ ہو رہا ہے، یہ تنظیمیں ایسی نئی پود تیار کر رہی ہیں؟ دائرہ در دائرہ بٹے ہیں یا کسی وحدت تک پہنچے ہیں؟ ایسی ہی کئی باتیں ہیں۔ مضافات کی ادبی تنظیموں کی جہاں تک بات ہے، تو وہ بھی موجود ہیں اور فعال کردار ادا کر رہی ہوں گی۔ اصل میں ہمارے ہاں جو 'ادبی گروہ بندیاں ہی سب سے بڑی بے ادبی ہے۔ اس نے نہ صرف ادبی فضا، بلکہ نئے لکھاریوں کو بھی بہت متاثر کیا ہے۔ یہاں آ کر معیار بدل جاتے ہیں۔ تنظیم کا سربراہ بڑا ادیب یا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ پھر جس طرح عہدے اسی طرح کا ادبی درجہ بنتا ہے۔ ستائش خوشامد اور "پی آر او کلچر" کو فروغ ملا، عہدوں کی بھاگ دوڑ میں بہت سارے کچلے جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا ناسور ہے، جس نے بہرحال ادبی ماحول کو پراگندہ کیا۔

☆ آپ ڈائجسٹ کے لکھاری ہیں، اردو ادب میں ڈائجسٹ کی کیا اہمیت ہے؟

◄ میں سمجھتا ہوں کہ اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں جتنا حصہ ڈائجسٹ کا ہے، شاید ہی کسی دوسرے ابلاغی ذریعہ کا ہوگا۔ یہ بحث اب بہت پرانی ہو چکی ہے کہ ڈائجسٹ میں پیش کیا جانے والا مواد ادبی ہے یا نہیں، دیکھا یہ جانا چاہئے کہ ڈائجسٹ نے قلم کاروں کی کس قدر کھیپ اردو ادب کو دی ہے۔ دراصل ڈائجسٹ کی اہمیت سے انکار ادبی تعصبانہ رویہ ہے۔ جس طرح جدید دور نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے، ایسے میں ہمارا نقاد یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ وہ ادب کو کس جہت میں دیکھے، کیونکہ ہمارا نقاد بھی ابھی پختہ کار نہیں ہوا ہے۔ وہ پرانی قدروں پر ڈٹا رہے یا زندگی کی نئی حقیقتوں کا سامنا کرے۔ ایک بات جو قاری سمجھ ہی نہیں سکتا، وہ اگر ادب عالیہ ہے تو ابلاغی نقطہ نظر سے وہ اتنی اہم تحریر نہیں ہے۔ لیکن وہی بات اگر انتہائی آسان انداز میں قاری تک پہنچا دی جائے تو وہ تحریر کا مقصد ہے۔

☆ کہانی آپ کی بنیادی یا کہہ لیں پسندیدہ صنف ہے، اس بارے آپ کیا کہیں گے۔

◄ کہانی ہماری جبلت میں شامل ہے۔ بچپن سے کہانی

ہمارے راسخ ہو جاتی ہے اور تمام عمر ہماری یہ دلچسپی نہیں جاتی۔ کہانی وہ اہم ترین ذریعہ ہے جس سے ہم اپنی اگلی نسل کو علم و حکمت اور دانش کا ورثہ منتقل کرتے ہیں۔ آپ دیکھیں وہ اشعار دوام کو پہنچے، جن میں ایک کہانی ہوتی ہے۔ کہانی بھی اسی وقت تک کہانی رہتی ہے، جب تک اس میں دلچسپی ہے۔ کیونکہ یہ اس کا بنیادی عنصر ہے۔

☆ بعض کتابیں، خاص طور پر ناول منظر عام پر تو آتے ہیں، لیکن ان کا کوئی خاص معیار نہیں ہوتا، یہاں تک کہ ان کی ہیت تک کی سمجھ نہیں، وہ بھی شائع ہو جاتے ہیں، ایسا کیوں ہے؟

◄ میں اسے مثبت انداز ہی میں لوں گا حوصلہ افزائی کا یہ بہترین طریقہ ہو سکتا ہے۔ اپنے آپ کو منوانے کا، اپنا اظہار کرنے کا۔ تاہم اس سے ہٹ کر میری ایک رائے ہے۔ اور وہ یہ کہ کوئی تو ایسا ادارہ ہو، جو کسی بھی کتاب کی ادبی حیثیت و مقام کا تعین کرے۔ کسی یونیورسٹی کا شعبہ ہی سہی۔ اس سے یہ ہوگا کہ میرے جیسا نو آموز بندہ جب لکھے گا تو یہ سوچ کر لکھے گا کہ اس کی ادبی حیثیت کیا ہوگی۔

☆ آپ کے پسندیدہ ادیب اور شاعر کون سے ہیں؟

◄ صرف ایک نام نہیں ہے، جیسے قدرت کے ہر پھول کو اپنی الگ الگ انفرادیت بخشی ہے، بالکل ایسے ہی ہر لکھاری اور خاص طور پر اساتذہ اپنی انفرادیت کے باعث میرے لئے معتبر ہیں۔ اب جیسے اے حمید، ان کی منظر نگاری، سعادت حسن منٹو کی کاٹ دار تحریر، کرشن چندر کی انسانیت پسندی، آغا اشرف کی پرکاری، عنایت اللہ اور علی سفیان آفاقی کی داستان گوئی، اختر حسین شیخ کا دبنگ انداز، شمیم ارژنگ نوید کی سلاست اور ایم اے راحت کا تخیلاتی۔ جدید دور میں بہت سارے نام ہیں۔ اسی طرح ڈرامہ نگاری میں عرفان مغل، اور عمیرہ احمد ہیں۔

☆ موسیقی سے شغف ہے؟ کیسی موسیقی سننا پسند کریں گے۔

◄ مجھے موسیقی بہت پسند ہے۔ اور یہ جو کہتے ہیں موسیقی روح کی غذا ہے، میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ ایسا کیوں ہے، یہ بہرحال ایک الگ بات ہے۔ لوک گیت اور اسکے پس منظر میں موسیقی میں ایک خاص اپنائیت کا احساس کار فرما ہوتا ہے۔ دیسی موسیقی میں سر کیساتھ گایا ہوا نغمہ پسند ہے۔ کیونکہ ہر آواز ہر گیت کے ساتھ ایک الگ تاثر رکھتی ہے۔ مجھے نور جہاں کے بعد نیرہ نور بہت پسند ہے، اے نیر، اور راحت فتح علی خاں۔ قوال مجھے عزیز میاں بہت پسند ہیں۔

☆ ایک روایتی سا سوال کہ کیا پیغام دینا چاہیں گے۔

◄ ہمارے ہاں کتاب پڑھنے کی روایت کو فروغ ملنا چاہئے۔ قوموں کی ترقی علم کے حصول میں ہے۔ کتاب سے جڑا ہوا رشتہ قوموں کو اوج کمال تک پہنچاتا ہے۔ اب یہ کام صرف حکومت کے ذمے ڈال دیا جائے تو زیادتی ہوگی۔ کتاب سے محبت ایک تحریک کی طرح ہونی چاہئے۔ کیونکہ اس وقت کتاب چھین لینے والی بہت ساری دوسری چیزیں موجود ہیں۔ جن کا ہماری نسل کو سامنا ہے۔ جن میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور وہ لکھنا چاہتے ہیں ان کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے۔ یہیں سے علم و فضل کی راہیں کھلتی ہیں۔

عامر بن علی / جاپان

پارس

تیرا عشق وہ پارس پتھر
جس نے
مجھ سے بے وقعت کو
سونے میں تبدیل کیا تھا
لیکن یہ تو آدھا سچ ہے!
سارا سچ جو سننا چاہو
تم بھی پارس جیسی ہی ہو
پارس بھی تو پتھر ہی ہے
اوروں کو سونا کرتا ہے
خود لیکن پتھر رہتا ہے

....

اکثر ایسا ہو جاتا ہے

ممکن ہے اس جگ کی رسمیں
ہم سے زیادہ طاقتور تھیں
پیار سے بڑھ کر زور آور تھیں
تو نے تب محسوس کیا تھا
میں تھوڑا سا بے پروا تھا
لیکن اب تو بدل گیا ہوں
پھر بھی بارش کے موسم میں
یا تنہائی کے عالم میں
سوچتا ہوں گر تو مل جاتا
جیون کیسا سندر ہوتا

فہیم شناس کاظمی/کراچی

چار جانب تماشا جاری ہے
دیکھتے رہتے ہیں خدا اور میں

وقت کی قید سے آزاد بھی کرسکتے ہیں
زندگی ہم تجھے ناشاد بھی کرسکتے ہیں
یہ خموشی تو ازل سے ہے وظیفہ میرا
لہر میں آئے تو ارشاد بھی کرسکتے ہیں
فکر میں ڈوبے ہر اک گام پہ کچھ تکتے لوگ
عشق کے دشت کو برباد بھی کرسکتے ہیں
یہ الگ بات کہ اک عمر سے بھولے ہوئے ہیں
ہم کسی روز تجھے یاد بھی کرسکتے ہیں
ہم جو خاموش ہیں بس اس کو غنیمت سمجھو
کھل کی رو سکتے ہیں فریاد بھی کرسکتے ہیں
ہجر ہی ہجر مسلسل ہمیں کیوں لاحق ہے
ہم مقرر کوئی معیاد بھی کرسکتے ہیں
زندگی بند گلی میں ہمیں لے آئی مگر
راستہ ہم کوئی ایجاد بھی کرسکتے ہیں

کسی کے دھیان میں اُلجھے ہوئے گزر آئے
ہر اک قدم پہ بھٹکتے رہے گزر آئے
وہ راستے وہ نگر کیا تھے بارگاہیں تھیں
ہر ایک گام پہ سجدے کئے گزر آئے
دمک رہی تھی زمیں آسمان نیلا تھا
سو دیکھتے رہے چلتے رہے گزر آئے
کہیں پہ ہم نہیں جاتے کہیں بلاتے نہیں
یوں زندگی کے شب و روز سے گزر آئے
کبھی کبھی تو بہت روئے اس گلی میں ہم
کبھی کبھی یونہی ہنستے ہوئے گزر آئے
بدل رہے تھے زمان ومکاں کے سب منظر
ہم اپنی کھوج میں کھوئے ہوئے گزر آئے
قدم قدم پہ ملے خواب، حیرت وعبرت
ہم اپنی دُھن میں رواں ہی رہے گزر آئے
یہ اور بات کہ ہم جانتے بہت کچھ تھے
مگر کسی سے بنا کچھ کہے گزر آئے

چار سُو ہونے کا نشہ اور میں
آئینہ خانے کی فضا اور میں
خود فریبی کی انتہا اور دل
ایک آسائشِ فنا اور میں
چار جانب تماشا جاری ہے
دیکھتے رہتے ہیں خدا اور میں
کوئی عالم ہو، کوئی موسم ہو
ساتھ رہتے ہیں کربلا اور میں
اک زمانے سے خالی کٹیا میں
اک پیالہ ہے اک دیا اور میں
شعر سے آدمی پرکھتے ہیں
صرف اب میرزا رسا اور میں

اُڑ رہا ہے غبارِ شب دیکھو
دیکھو اس آسماں کو اب دیکھو
حسن کو جتنی دیر جب دیکھو
ایسے دیکھو کہ سب کا سب دیکھو
دیکھنا ہو جو دیکھنا اُس کا
وہ مجھے دیکھتا ہو تب دیکھو
کوئی بتلائے کیسے دیکھوں اُسے
کوئی سمجھائے اس کو کب دیکھو
میں تو بس دیکھتا اُسی کو ہوں
جاؤ تم لوگ اپنا رب دیکھو
آئینے سے دعا سلام کرو
یعنی آئینہ بے سبب دیکھو
سادگی میں بھی ایک پُرکاری
اور ہے جو بھی اس کا ڈھب دیکھو
دل میں لو دے رہی یاد اُس کی
یہ دیا جل رہا ہے جب دیکھو
بھول جاؤ میں کون ہوں کیا ہوں
نام دیکھو نہ اب نسب دیکھو
اب تو خود کو بھلا چکا ہوں میں
گر مجھے دیکھنا ہے اب دیکھو
سو انہیں دیکھتا ہوں میں بھی شناس
کہہ رہے ہیں وہ چشم و لب دیکھو

وحید بسمل/ایبٹ آباد

موج سے اُلجھے تلاطم سے کنارا مانگے
عشق تو کچے گھڑے سے بھی سہارا مانگے

اپنی چاہت کا سزاوار بنا دو مجھ کو
کچھ نہ کچھ اے مرے غم خوار! بنا دو مجھ کو
میں بکھر جاؤں نہ ٹوٹے ہوئے شیشے کی طرح
توڑ بھی دو تو پھر اک بار بنا دو مجھ کو
کب یہ چاہا کہ مرے ساتھ ہو تم بھی رُسوا
کب کہا، سرخیِ اخبار بنا دو مجھ کو
مجھ کو اُس رنگ میں رنگو کہ یہ دنیا دیکھے
اک ذرا اپنی طرح یار! بنا دو مجھ کو
کیا غرض اس سے کہ شہرت سے بھلا ہو کس کا
رونقِ کوچہ دلدار بنا دو مجھ کو
مجھ پہ کھل جائے مری ذات کا یہ سرِ نہاں
اے جنوں! واقفِ اسرار بنا دو مجھ کو
کوئی نسبت تو ہو اس شاخِ چمن سے بسمل
گل کے پہلو میں چلو، خار بنا دو مجھ کو

اس دل کو تری خاطر رسوائی گوارا ہے
تو شاد رہے ہر دم منشا یہ ہمارا ہے
کھڑکی میں کبھی آئے مہتاب سا وہ چہرہ
پھر اس کی تمنا ہے پھر اس کو پکارا ہے
دریائے محبت کا گمنام مسافر ہوں
ناؤ بھی شکستہ ہے اور دور کنارہ ہے
کچھ محوِ تماشا ہیں کچھ راکھ ہوئے جل کر
یہ آپ کی محفل ہے، ہر سانس شرارہ ہے
تو چاہے کہیں بھی ہو، تو چاہے کہیں جائے
بسمل کو تسلی ہے، تو صرف ہمارا ہے

مرا دل سہولت سے یوں توڑ کر
جدا ہو گیا وہ مجھے چھوڑ کر
اسے لوٹ آنے میں صدیاں لگیں
گئی آس ملنے کی منہ موڑ کر
مرا عکس پورا ہو گر دیکھنا
دکھاؤ مجھے آئینہ جوڑ کر
محبت میں برباد ہم ہو گئے
ملا کیا ستم گر کو دل توڑ کر
حقائق سے پردہ ہٹا، رکھ دیا
کسی سوچ نے مجھ کو جھنجھوڑ کر
ہے گر داستانِ سفر کی طلب
تو دیکھو مرے آبلے چھوڑ کر
تو کانٹوں میں بسمل اُلجھ جائے گا
سمجھ جائے گا پھول کو توڑ کر

موج سے اُلجھے تلاطم سے کنارا مانگے
عشق تو کچے گھڑے سے بھی سہارا مانگے
خودسرِ شام ہی جل جائے شبِ تار سے کیوں؟
کوئی جگنو یا چمکتا ہوا تارا مانگے
یہ تو آئینہ ہے پتھر نہ گراؤ اس پر
دل تو بس ٹوٹ بکھرنے کو اشارا مانگے
دل تو ہم دے ہی چکے وقتِ ملاقات اُسے
جاں بھی حاضر ہے اگر جان سے پیارا مانگے
کوئی راحت کی گھڑی وہ بھی سرِ دشتِ وفا
کیا کوئی گردشِ حالات کا مارا مانگے
کوئی کیا جانے ترے درد کو پیارے بسمل
کس مسیحا سے کوئی درد کا چارا مانگے

اپنے ذوقِ جستجو پر ناز فرماتا ہوں میں
منزلِ دشوار سے گزرا چلا جاتا ہوں
رہنما! مجھ کو بتا دینا کہ منزل آ گئی
بے خودیِ شوق میں آگے نکل جاتا ہوں میں
گم نہ ہو جائے کہیں ذوقِ تجسس، اس لیے
پاس جب آتی ہے منزل، دور ہو جاتا ہوں میں
ہو تو جاتی ہے شبِ غم کی سحر یارو! مگر
کیا کہوں کن مشکلوں سے دل کو بہلاتا ہوں میں
جس کو دیکھے بن دلِ ناداں نہیں پاتا قرار
کیا کروں، اس شخص کو اپنا نہیں پاتا ہوں میں
بے رُخی اپنوں کی بسمل دیکھتا ہوں جب کبھی
بولتا کچھ بھی نہیں محفل سے اُٹھ جاتا ہوں میں

جان کر اندوہگیں، اس نے اُٹھایا ہے مجھے
راستہ منزل کا اس نے پھر دکھایا ہے مجھے
میری آنکھوں کے مقدر میں لکھے تھے رتجگے
ہاتھ رکھ کر ماتھے پر اس نے سلایا ہے مجھے
عقل و دانش کی ہی تاویلوں میں تھا اُلجھا ہوا
عشق باہر اُلجھنوں سے، لے کے آیا ہے مجھے
جگ سے بیگانہ کیا کیسا جمالِ یار نے
اک نظر میں اپنا گرویدہ بنایا ہے مجھے
جی کرے، جاں وار دوں، اس کی ادائے ناز پر
کیا سراپا، اس بتِ کافر کا بھایا ہے مجھے
کیا یہ کم احسان ہے مجھ پر، غمِ جاناں! ترا
تو نے کس انداز سے جینا سکھایا ہے مجھے
کیا وفاؤں کا صلہ غم کے سوا، بسمل! ملا؟
اس خلش نے کتنے برسوں تک رُلایا ہے مجھے

طاہر عدیل ڈنمارک

درمیاں آسماں زمیں ہیں مرے — یا کہ دونوں کہ درمیاں ہوں میں؟

لگتا ہے مجھے وہ کہ پریشان بہت ہے
سیلاب کے آنے کا بھی امکان بہت ہے
اندر سے عمارت وہ نکل آئی ہے خالی
باہر سے تو لگتا تھا کہ سامان بہت ہے
میں دنگ ہوا جاتا ہوں اب دیکھ کے اُس کو
اور وہ بھی مجھے دیکھ کے حیران بہت ہے
جس کام میں ہوتا ہے بہت نفع یہاں پر
یہ سوچ لو اُس کام میں نقصان بہت ہے
کچھ کر کے دکھانا بڑا مشکل ہے مرے دوست
کر دینا یونہی بات تو آسان بہت ہے
ہر شخص سے کھاتا ہے نیا دھوکہ ہمیشہ
یہ دل ہے کہ بچپن سے ہی نادان بہت ہے
گمنام یہاں دیکھا ہے طاہر کو وگرنہ
اس شہر میں ہر شخص کی پہچان بہت ہے

آسماں بہت سے ہیں آسماں سے آگے بھی
آؤ گھر بناتے ہیں لامکاں سے آگے بھی
میں یہی سمجھتا تھا سب کو پیچھے چھوڑ آیا
ایک نقشِ پا دیکھا ہے یہاں سے آگے بھی
اپنی جان کر منزل میں جہاں بھی پہنچا ہوں
مختصر مسافت تھی اک وہاں سے آگے بھی
اُس کو یہ گماں ہے اب چاہتا ہے وہ مجھ کو
اور ہے یقیں میرا اس گماں سے آگے بھی
دور سے انہیں شاید نظر آ گئی منزل
لوگ چل پڑے ہیں جو کارواں سے آگے بھی
اک ستارے سے آگے دیکھ ہی نہیں پائے
کہکشائیں کتنی تھیں کہکشاں سے آگے بھی
زندگی گزاری ہے اس لیے یہاں طاہر
آستاں اُسی کا تھا آستاں سے آگے بھی

دیے کی لو میں ستارہ دکھائی دینے لگا
جو چاند چہرہ تمہارا دکھائی دینے لگا
میں جب بھی اُترا سمندر سمجھ کے پانی میں
تو اُس کا دوجا کنارا دکھائی دینے لگا
بجھی ہوئی تھی جو برسوں سے آگ، کل اُس کی
جو راکھ پلٹی، شرارہ دکھائی دینے لگا
جو دیکھا ماں کی طرف آنکھ بھر کے میں نے کبھی
بہشت کا ہی نظارا دکھائی دینے لگا
یہ دوستوں کی عنایت ہے اور کچھ بھی نہیں
میں بے سہارا دوبارہ دکھائی دینے لگا
نئی نئی تھی محبت تو ہم سا کوئی نہ تھا
کہ عیب اب تو ہمارا دکھائی دینے لگا
مرے قریب خدا اس قدر رہا طاہر
کہ جب بھی اُس کو پکارا دکھائی دینے لگا

اس بات کا لوگوں پہ اثر کیوں نہیں ہوتا
ہر کوئی فرشتہ ہے بشر کیوں نہیں ہوتا
فرقت کا گزرتا ہی نہیں ہے کوئی لمحہ
قربت کا تری لمحہ امر کیوں نہیں ہوتا
سورج کی طرح دھوپ دیا کرتے ہیں سب لوگ
اس دھوپ میں ہر شخص شجر کیوں نہیں ہوتا
منزل پہ پہنچ کر بھی نہیں ملتی ہے منزل
اب ختم یہ جیون سے سفر کیوں نہیں ہوتا
ہو وصل کا لمحہ یا محبت کا کوئی پل
ہر بار گزر جائے بسر کیوں نہیں ہوتا
کیوں شہر ہیں کانٹوں کے پڑاؤ میں ہمارے
اک بار بھی پھولوں کا نگر کیوں نہیں ہوتا
ہاں اُس سے کئی بار کیا ترکِ تعلق
ہر بار ہی ہوتا ہے مگر کیوں نہیں ہوتا
کیا میری محبت میں کمی ہے کوئی طاہر
جو حال اِدھر ہے وہ اُدھر کیوں نہیں ہوتا

ان کہی ایک داستاں ہوں میں
غیر آباد سا مکاں ہوں میں
ہر کسی سے خفا نہیں ہوتا
تم پہ ہی جانِ مہرباں ہوں میں
بھول کر بھی بھلا نہ پاؤ گے
جو نہیں مٹتا وہ نشاں ہوں میں
بات ساری ہے وقت کی ورنہ
تم کھڑے تھے وہیں جہاں ہوں میں
میں یہاں تم کو لایا تھا لیکن
تم یہاں ہو مگر کہاں ہوں میں
اب تو حق ہے میں راستے سے کہوں
تم رُکے ہو، مگر رواں ہوں میں
درمیاں آسماں زمیں ہیں مرے
یا کہ دونوں کہ درمیاں ہوں میں؟
جو جلائے تھے ہاتھ سے طاہر
اُن چراغوں کا ہی دھواں ہوں میں

ہمایوں پرویز شاہد/لاہور

کبھی شعلوں میں کھلتی ہے کبھی سولی سجاتی ہے
محبت اپنے ہونے کا پتہ خود ہی بتاتی ہے

روح کو جسم کے پنجرے سے نکل جانا ہے
آنکھ میں ٹھہرے ہوئے پل کو بدل جانا ہے
کر دیا فصلِ اُداسی کو تناور جس نے
میں نے اُس شامِ جدائی کو اجل جانا ہے
جو بھی تخلیق ہوا ہے اُسے مٹنا ہے ضرور
ایک آواز سے ہر شے کو پگھل جانا ہے
یہ زر و جبہ و دستار کو جائیں گے نہیں
ساتھ جانا ہے تو انساں کا عمل جانا ہے
زرد ہو جائیں گے سرسبز گلستاں آخر
چاند سورج کو ستاروں کو بھی ڈھل جانا ہے
حرص و لالچ کے چراغوں کو بجھا کر دیکھو
سر پہ آیا ہوا طوفان بھی ٹل جانا ہے
رہ گیا بن کے وہ شاہد تیری آنکھوں کا نصیب
جس کو ہر طور تری حد سے نکل جانا ہے

ناکامیٔ خلوص کے آثار دیکھ کر
تھرا گیا ہوں صحن میں دیوار دیکھ کر
شکوہ کروں نہ دوستو کیسے نصیب کا
ہر آشنا کو ان کا طرفدار دیکھ کر
اے کاتبِ نصیب بدل آنکھ کا نصیب
اُکتا گیا ہوں مصر کا بازار دیکھ کر
پہلے قدم پہ وقت نے منظر بدل دیا
جب بھی چلا ہوں سامنے گلزار دیکھ کر
برسی ہے میری آنکھ تو صحرا کی پیاس پر
بادل گزر گیا ہے کئی بار دیکھ کر
سورج وہیں پہ آ گیا مرکز کو چھوڑ کر
بیٹھا جہاں بھی سایہ دیوار دیکھ کر
منصف مرے ہنر کا اُڑاتے نہ یوں مذاق
کرتے اگر وہ فیصلہ معیار دیکھ کر
سورج بھی اور چاند ستارے بھی چھپ گئے
شاہد کو روشنی کا طلب گار دیکھ کر

سینے میں جو درد چھپائے پھرتے ہیں
چاروں جانب ایسے سائے پھرتے ہیں
اپنے گھروں میں وحشت ناچ رہی ہے
امن کو ہم پیغام بنائے پھرتے ہیں
کس کا ذکر ہوا کے ہونٹوں پر ہے آج
رنگ دھنک کے موج میں آئے پھرتے ہیں
ذکر کیا تھا ہم نے پھول اور بھنورے کا
لیکن ہم سے وہ شرمائے پھرتے ہیں
بھول بھلا کے خوف خدا کا زندہ ہیں
اور پھر جنت پے اِترائے پھرتے ہیں
پار کرا دے گا ان وحشی لہروں سے
کچے سے اُمید لگائے پھرتے ہیں
آئے گی پردیس سے چٹھی، آئے گی
دُکھیا دل کو یوں بہلائے پھرتے ہیں
چہروں پے مسکان سجا کے شاہد لوگ
اپنی لاش کو آپ اُٹھائے پھرتے ہیں

کبھی شعلوں میں کھلتی ہے کبھی سولی سجاتی ہے
محبت اپنے ہونے کا پتہ خود ہی بتاتی ہے
کلی چٹخے جو گلشن میں مہک جاتی ہے صحرا تک
دعا دل سے اگر نکلے فلک سے پار جاتی ہے
میں جب چاہوں جہاں چاہوں وہ پیکر روبرو دیکھو
مرے جذبوں کی سچائی مجھے اکثر بتاتی ہے
وہ آئے گا اُسے آنا پڑے گا لوٹ کر اک دن
روانی میرے سانسوں کی یہی مژدہ سناتی ہے
مرے دل کے پھپھولے ہیں مری نظمیں مری غزلیں
غلط کیا ہے اگر دنیا نظر مجھ سے چراتی ہے
ذرا سا ہے مگر پھر بھی مٹاتا ہے اندھیروں کو
اے جگنو تیری یہ عادت مری ہمت بڑھاتی ہے
کرے گی بے وفائی زندگی ہم سے بھی اے شاہد
کہ جس کو بھی یہ ملتی ہے اُسی کو چھوڑ جاتی ہے

ہوا کو پکڑو کسی صدا کا نشان ڈھونڈو
جو تم ہو کامل تو پھر سے کی اُڑان ڈھونڈو
تمہارے گھر کا اندھیرا جس سے شکست کھائے
تم اپنے اندر وہ روشنی مہربان ڈھونڈو
اب اپنے جذبوں کی رائیگانی پے رو رہے ہیں
کہا تھا کس نے کہ مُردہ روحوں میں جان ڈھونڈو
نہ دشمنوں پر لگاؤ تہمت تم اپنے خوں کی
جہاں سے برسے ہیں تیر تم وہ مچان ڈھونڈو
پڑاؤ ڈالو نہ خواہشوں کے حسین گھر میں
کرو مسافت حقیقتوں کا جہان ڈھونڈو
دیارِ دل میں جگہ تھی جتنی وہ بک چکی ہے
چلو کہیں اور جا کے تم اب مکان ڈھونڈو
جہاں خدا ہے وہیں پہ شاہد تمہیں ملے گی
سبھی دُکھوں سے اُداسیوں سے امان ڈھونڈو

مختصر ادبی خبریں

✦ نعت مرکز کے چیف ایگزیکٹو اور معروف نعت گو شاعر ارسلان ارسل کی والدہ گزشتہ دنوں انتقال کر گئیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جوار رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

✦ ممتاز شاعر عمران نقوی کی والدہ گزشتہ دنوں خالق حقیقی سے جا ملیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

✦ انجمن ترقی پسند مصنفین کے زیر اہتمام مرزا غالب سیمینار پاک ٹی ہاؤس میں منعقد کیا گیا۔ صدارت غلام حسین ساجد نے کی۔

✦ پیس اینڈ ایجوکیشن فاؤنڈیشن اور اسلامی نظریاتی کونسل کے اشتراک سے فلیٹیز ہوٹل میں قومی امن کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ جس میں نامور شخصیات اور صحافیوں نے شرکت کی۔

✦ ڈگری کالج برائے خواتین میں نامور شاعرات کے ساتھ محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔

✦ جناب نوید مرزا صاحب کی کتب کی تقریب رونمائی الحمرا ادبی بیٹھک لاہور میں منعقد کی گئی۔

✦ اوکاڑہ کے مشہور شاعر قمر حجازی رضائے الٰہی سے وفات پا گئے۔

✦ کے ایم سی آفیسرز ایسوسی ایشن اور یونیورسٹی آف گریجویشن فورم کینیڈا کراچی چیپٹر کے زیر اہتمام غالب و صادقین کی یاد میں محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔

✦ انجمن محبان اُردو قطر میں مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ نامور شعرا نے شرکت کی۔

✦ ساہیوال میں پاکستان کرسچین رائٹرز گلڈ کی جانب سے مشاعرہ اور کتب کی رونمائی کا اہتمام کیا گیا۔

✦ ثمینہ خالد قریشی سابقہ ڈپٹی چیف لائبریرین پنجاب یونیورسٹی لائبریری قضائے الٰہی سے انتقال فرما گئیں۔

✦ نامور شاعر مسعود احمد اوکاڑوی کی والدہ رضائے الٰہی سے انتقال فرما گئیں۔

✦ کراچی یونیورسٹی میں سالانہ مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت جناب پیرزادہ قاسم نے کی۔

✦ عبداللہ گورنمنٹ کالج میں شعبہ اُردو کی ادبی کمیٹی نے مرزا غالب کی برسی عمدہ طریقے سے منائی۔

✦ اوکاڑہ کے معروف محقق و شاعر قمر حجازی انتقال فرما گئے۔

✦ حلقہ ارباب ادب قصور کے زیر اہتمام ڈاکٹر غافر شہزاد کے ساتھ ایک شعری نشست کا اہتمام کیا گیا۔ صدارت فرحت عباس شاہ نے کی۔

✦ معروف صحافی سعید آسی صاحب کے استاد محترم اور سابقہ جج لاہور ہائی کورٹ میاں آفتاب فرخ انتقال فرما گئے۔

✦ نامور شاعر ثناء اللہ ظہیر کے والد محترم رضائے الٰہی سے انتقال فرما گئے۔

✦ آرٹس کونسل کی ادبی کمیٹی کے زیر اہتمام مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا جس کا موضوع اکیسویں صدی اور اُردو شاعری کی صورتِ حال تقاضے اور مسائل تھا۔ نامور رائٹرز نے اظہارِ خیال کیا۔

✦ ہالینڈ میں مقیم سیّد ارشاد قمر بھی رضائے الٰہی سے وفات پا گئے۔

✦ ادب قبیلہ پاک پتن شریف کے زیر اہتمام جناب موج دین فریدی کے شعری مجموعے کی تقریب رونمائی اور محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔

✦ سینئر آرٹسٹ باقر علی بھی وفات پا گئے۔

✦ دوسری اُردو عالمی کانفرنس چوک اعظم لیہ کے زیر اہتمام نامور شعرا کے ساتھ محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔

✦ پی ایس او پچار کے زیر اہتمام عرفان الحق صائم کی یاد میں بین اللسانی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ جہاں آرا تبسم مہمانِ خاص تھیں۔

✦ انجمن ترقی پسند مصنفین کے زیر اہتمام الحمرا ہال میں ایک روزہ ''سعادت حسن منٹو کانفرنس'' کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں منٹو کی بیٹی نصرت منٹو نے خصوصی شرکت کی۔ دیگر نامور رائٹرز نے بھی حاضری لگوائی۔

✦ کلکتہ میں عالمی مشاعرے کا انعقاد ہوا جس میں

دبئی سے ڈاکٹر زبیر فاروق نے خصوصی شرکت کی۔

✦ چکوال کے معروف شاعر اور کالم نگار مرزا احمد نور طائر انتقال فرما گئے۔

✦ نوشی گیلانی کے اعزاز میں فیصل آباد آرٹس کونسل میں محفل مشاعرہ منعقد ہوا۔

✦ معروف فکشن نگار اقبال مجید اب ہم میں نہیں رہے۔

✦ حلقہ اربابِ ذوق اسلام آباد کی جانب سے اُردو نظم کے نامور شاعر ارشد معراج کی کتاب ''دوستوں کے درمیاں'' کے حوالے سے تنقیدی نشست کا اہتمام کیا گیا۔

✦ لندن میں اُردو کے نامور افسانہ نگار اور شاعر گلشن کھنہ کا انتقال ہو گیا۔

✦ معروف مصنفہ خالدہ حسین داغِ مفارقت دے گئیں۔

✦ پی ای سی ایس ایچ کراچی میں بیادِ پروین شاکر مشاعرہ منعقد کیا گیا۔

✦ پنجابی کے معروف مصنف ڈاکٹر عادل صدیقی انتقال فرما گئے۔

✦ کراچی میں بیادِ جمال پانی پتی مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔

✦ مشہور شاعر، فلسفی اور مجید امجد شناس ڈاکٹر محمد امین کو جاپان کا اعلیٰ شاہی اعزاز ملنے کی خوشی میں ساہیوال آرٹس کونسل کی جانب سے تقریب پذیرائی کا اہتمام کیا گیا۔

✦ شاعر اہل بیت شاہد جعفری بھی خالق حقیقی سے جا ملے۔

✦ بین الاقوامی ادبی وثقافتی تنظیم سخنور راولپنڈی آرٹس کونسل کے اشتراک سے کالم نگار، ڈرامہ نگار اور افسانہ نگار فرحین چودھری کے افسانوی مجموعے بیٹھا سچ کی تقریب رونمائی و پذیرائی منعقد ہوئی۔

✦ معروف فکشن نگار حامد سراج کی طبیعت ناساز ہے۔

✦ محترمہ ناہید اختر حلقہ اربابِ ذوق کی بلا مقابلہ سیکرٹری منتخب ہو گئی۔

✦ ادبی وثقافتی تنظیم وجدان کے زیر اہتمام فرانس میں مقیم نوجوان شاعر آصف جاوید عاصی کے ساتھ ایک شام کا اہتمام کیا گیا۔

✦ جامعہ کراچی کی جانب سے جرمنی میں مقیم عشرت معین سیما کے ساتھ ایک نشست کا اہتمام کیا گیا۔ صدارت عابد علی بیگ نے کی۔

✦ برطانیہ سے ڈاکٹر ناہید کیانی صاحبہ نے اپنے شعری مجموعہ دل کو آئینہ کر لیا میں نے کی تقریب پذیرائی کا اہتمام کیا۔

✦ قصور کی نامور شاعرہ طاہرہ احسان انتقال فرما گئی۔

✦ ساؤتھ ایشین میڈیا سنٹر لاہور نے ایک شام احمد بشیر کے نام کا اہتمام کیا۔ میزبان ان کی بیٹی نیلم احمد بشیر تھیں۔

✦ موجِ سخن ادبی فورم اور عالمی ادب اکادمی پاکستان کراچی کی جانب سے بیادِ جون ایلیا کا انعقاد کیا گیا۔

✦ بہت سی کتابوں کے مصنف ڈاکٹر سلیم اختر انتقال فرما گئے۔

✦ ادب پرور شخصیت جناب بابر مفتی کی رہائش گاہ پر ادب قبیلہ پاکپتن کے زیر اہتمام ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا۔

✦ ممتاز شاعر اور نقابت کار جناب علی یاسر کے ڈاکٹر علی یاسر بننے کی خوشی میں گوجرانوالہ میں ایک مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔

✦ بزم پرنم الہٰ آبادی کے چیئرمین محمد اقبال شجاع آبادی عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کے لیے ۴ مارچ کو سعودی عرب روانہ ہوں گے۔

✦ ڈائریکٹوریٹ آف الیکٹرانک میڈیا اینڈ پبلی کیشنز وزارت اطلاعات ونشریات حکومت پاکستان لاہور کے زیر اہتمام شائع ہونے والے ادبی جریدے ''منو بھائی ایڈیشن ماہ نو'' کی تقریب پذیرائی الحمراء ہال نمبر ۳، الحمراء آرٹس سنٹر شاہراہ قائداعظم لاہور میں منعقد ہوئی۔

✦ ڈاکٹر اجمل نیازی کے برادر محترم خالق حقیقی سے جا ملے چند روز قبل ہی نیازی صاحب کی والدہ انتقال کر گئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ دونوں کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ (آمین) ادارہ ارژنگ ان کے غم میں برابر کا شریک اور دعا گو ہے۔

✦ بزمِ عالل کا مشاعرہ لاہور میں منعقد ہوا۔ ممتاز شاعرہ اور ماہر تعلیم منزہ سحر نے کیا۔ صدارت فرحت عباس شاہ نے ممتاز شعراء نے شرکت کی۔

✦ پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس شعبہ تاریخ کے زیر اہتمام باقی احمد پوری کی صدارت میں محفل مشاعرہ منعقد ہوئی جس کا اہتمام محمد جمیل خان کی نگرانی میں ہوا۔

✦ 26 دسمبر 2018ء کو ''نئی اُمید ادبی فورم'' کی ایوارڈ تقریب ''ای لائبریری'' نزد قذافی سٹیڈیم لاہور میں ہوئی۔ سینئر شعراء اقبال راہی، ممتاز راشد لاہوری اور فیاض قریشی کو بھی ایوارڈ ملے۔

تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

نام کتاب : صاحب (حمدیہ مجموعہ)/شاعر: حسن عباسی (لاہور)/سنِ اشاعت : جنوری 2018ء/صفحات : 128/قیمت : 300روپے

تبصرہ نگار : ممتاز راشد لاہوری (مدیر اعلیٰ : سہ ماہی "خیال و فن لاہور/دوحہ) 27۔اگست 2018ء

ناشر : نستعلیق مطبوعات،3-F۔الفیر وز سنٹر،غزنی سٹریٹ،اردو بازار،لاہور

عالمی شہرت یافتہ شاعر حسن عباسی نے پہلے ایک حمدیہ مجموعہ "سائیں" پیش کیا تھا۔اب اُن کے اس نئے حمدیہ مجموعے کو دیباچہ نگار نذیر قیصر نے "خدا کے حضور نیا گیت" قرار دیا ہے۔ویسے اس کتاب میں بشریٰ رحمٰن، ایوب خاور، لطیف ساحل اور لیلیٰ صفدر کے دیباچے بھی شامل ہیں۔حسن عباسی نے انتساب اپنے بڑے بھائی حاجی غلام محی الدین عباسی کے نام کیا ہے۔بہت معیاری انداز میں شائع شدہ اس کتاب میں سبھی حمدوں کی ردیف میں لفظ "صاحب" لازمی طور پر موجود ہے اور حسن عباسی نے اس اہتمام کے ساتھ کئی ایک باکمال حمدیہ اشعار نکالے ہیں۔مثلاً یہ مقطع ؎ آپ کی حمد کا کرشمہ ہے ہوگئی شاعری نئی صاحب

اس کتاب کے سرورق پر آسمان میں اڑتے ہوئے پرندوں کا منظر ہے۔بیک ٹائیٹل پر اس سرورق کی تصویر کے نیچے حسن عباسی کے یہ تین حمدیہ اشعار دیے گئے ہیں:

غضب کی چلتے ہو چالیں صاحب — ہم اپنے مہرے اُٹھا لیں صاحب؟
شکوے ہوں گے ہزار صاحب سے — ہو گیا ہم کو پیار صاحب سے
سب نے دیکھا مکان صاحب کا — میں نے دیکھا جہان صاحب کا

حسن عباسی کو اپنی شاعری میں اپنے قلبی احساسات و جذبات کے منفرد اظہار کا سلیقہ آتا ہے اور یہی ہنر انھوں نے "صاحب" میں اللہ رب العزت کے لیے تخلیق کردہ اپنی "غزل نما" حمدیہ نظموں میں بھی نہایت احسن انداز میں برتا ہے۔اس کتاب سے کچھ اور منتخب اشعار نذرِ قارئین ہیں:۔

میں نے شعلے کو چھو کے دیکھا ہے — اُس کے اندر گلاب ہے صاحب
اک لڑکی اچھی لگتی ہے — آپ سے کیا پردہ ہے صاحب
حمد لکھ کر بھی کم نہیں ہوتی — مجھ میں کیسی بھڑاس ہے صاحب
مزار دیکھا جہاں بھی اپنا — تمھاری چادر چڑھائی صاحب
تمھارے حصے میں دوست آئے — ہمارے حصے میں بھائی صاحب
میں سُن رہا ہوں سکوتِ صحرا — کمال کی دُھن بنائی صاحب
یہ کس نے معصوم لڑکیوں کو — دلوں کی چوری سکھائی صاحب
اشک اشرفی جیسے اُن کو بخشے جائیں — سُرخی مائل آنکھوں کے کاسے ہیں صاحب
اُس دن دوزخ کو پھر اپنی پڑ جائے گی — جس دن میری بات سُنیں گے ساری صاحب
آپ دریچہ کھول کے میرے کمرے کا — مجھ سے ملنے آئی پُروا صاحب کی

حسن عباسی نے اپنی حمدوں میں کئی قوافی اور کئی بحور بدلی ہیں جس سے نئے نئے مضامین سامنے آئے ہیں،بعض اشعار میں تعلّی کا رنگ نمایاں ہے،کئی جگہ گہرا طنز بھی ملتا ہے،ان حمدوں میں ہندی، انگریزی، پنجابی رنگ کے اشعار بھی کافی ہیں۔کچھ مقامات پر اشکالات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔دو تین جگہ تضاد کا رنگ بھی ہے مگر مجموعی طور پر بہت مضبوط شاعری کی کتاب ہے۔اپنی کتاب حسن عباسی نے مجھے دو جولائی 2018ء کو عنایت کی تھی،اُن کا دلی شکریہ۔

نام کتاب : نقدِ سخن (ادبی مضامین) / ادیب : جسارت خیالی (لیّہ) / سنِ اشاعت : جولائی 2018ء / صفحات : 176 / قیمت : 500 روپے
تبصرہ نگار : ممتاز راشد لاہوری (مدیر اعلیٰ سہ ماہی "خیال وفن لاہور / دوحہ) 15 فروری 2019ء
ناشر : رنگِ ادب پبلی کیشنز، آفس نمبر 5۔ کتاب مارکیٹ، اردو بازار، کراچی

بڑے شہروں سے دُور مضافاتی قصبوں اور شہروں میں رہ کر ادبی لحاظ سے اپنا اعلیٰ مقام بنانے والے ادیبوں میں پہاڑپور (لیّہ) کے جسارت خیالی کا نام بہت نمایاں ہے۔ انھوں نے نقد و نظر کے میدان میں خاصا کام کیا ہے۔ ان کے ایسے مضامین کا یہ مجموعہ معیاری انداز میں شائع ہوا ہے۔ 25 مضامین کی اس کتاب میں صابر ظفر، وسیم بریلوی، منظر بھوپالی، ڈاکٹر قمر رئیس، رئیس الدین رئیس، ناصر ملک، نجمہ شاہین کھوسہ، شاعر علی شاعرؔ اور خورشید بیگ میلسوی جیسے اہم ادبی ناموں کے ساتھ ساتھ کچھ نومشق ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں بھی مضامین شامل ہیں۔ پیش لفظ میں جسارت خیالی نے تفصیلی طور پر سرزمین لیّہ سے تعلق رکھنے والے اہل قلم کو فراخدلی کے ساتھ متعارف کرایا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر مختار ظفر (ملتان) کا دیباچہ اس کتاب کے مندرجات کا عمدہ تجزیہ پیش کرتا نظر آتا ہے۔ اس میں صاحب کتاب جسارت خیالی کی صلاحیتوں کو بھی خوب سراہا گیا ہے۔ مجھے یہ کتاب جسارت خیالی صاحب نے 4 فروری 2019ء کو بذریعہ ڈاک لیّہ سے لاہور بھیجی تھی۔ اس کا مطالعہ سیر حاصلی کا سبب رہا۔ مستقبل میں جسارت خیالی صاحب سے ایسے کئی اور پُرمغز مضامین کی توقع ہے۔۔۔۔ع۔۔۔۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

نام کتاب : دوسرا کوئی نہیں / شاعر : وحید قندیل / سنِ اشاعت : 2019ء / صفحات : 184 / قیمت : 400 روپے
تبصرہ نگار : ممتاز راشد لاہوری (مدیر اعلیٰ سہ ماہی "خیال وفن لاہور / دوحہ) 15 فروری 2019ء
ناشر : رنگِ ادب پبلی کیشنز، آفس نمبر 5۔ کتاب مارکیٹ، اردو بازار، کراچی

ہاورڈ یونیورسٹی میں میرے لیکچر کے دوران ایک امریکی نے مجھ سے سوال کیا: "کہا جاتا ہے کہ یہ زمانہ تہذیبوں کے تصادم کا زمانہ ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟" میں نے جواب دیا کہ "یہ زمانہ تہذیبوں کے تصادم کا نہیں تہذیبوں کی رفاقت کا زمانہ ہے۔" اور میں جب بھی طاہر عدیل جیسے کسی شاعر کی تحریر کا مطالعہ کرتا ہوں تو مجھے اپنے قول کی صداقت پر یقین ہونے لگتا ہے۔ طاہر عدیل کی طرح اپنے وطن سے دور معاشی جلاوطنی میں جتنے بھی اہل قلم محبت اور خوبصورتی کی شاعری کر رہے ہیں وہ تہذیبوں کے درمیان رفاقت اور ہم آہنگی کی داستان رقم کرتے ہیں۔ ویسے بھی ہم لوگ مغرب کے تمام اقوال اور مفروضوں کو ایک نئی فلاسفی سمجھ کر نہ صرف اپنانے لگتے ہیں بلکہ دہرانے میں بھی دیر نہیں لگاتے۔ "تہذیبوں کے تصادم" کی طرح "تاریخ کا خاتمہ"، "مصنف کی موت"، "ساختیات" یہ سب اقوال اور مفروضے گہرائی میں جھانک کر دیکھیے تو اندر سے خالی ہیں۔ تاریخ کا خاتمہ کبھی نہیں ہوتا۔ اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ مصنف اپنے لفظوں میں زندہ رہتا ہے۔ ساختیات فکر وفن میں مواد اور خیال کی آمیزش سے باہر کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ یہ خیر مغرب والوں نے ہمیں لمبی بحث میں اُلجھا دیا ہے۔ طاہر عدیل جیسے سیدھے سادے شاعرانہ مباحث میں اُلجھے بغیر تمام انسانوں اور زمانوں کے درمیان محبت اور خوبصورتی کی دھنک بن کر ظاہر ہوتے ہیں۔ ہم محبت اور خوبصورتی تلاش کرنے والوں کو ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ وہ ہمارے دروازوں اور دریچوں سے دور بیٹھے اپنے رنگ، اپنی روشنیاں اپنی خوشبوئیں اور اپنی سبک ہوائیں ہماری طرف روانہ کرتے رہتے ہیں۔ بس شاعری کی یہی فلاسفی ہمارے لیے بہت ہے کہ ہم بہت سی تہذیبوں اور زمانوں کو ایک ساتھ جیتے ہیں۔ محبت اور خوبصورتی کے اس دھنک کے لیے طاہر عدیل کو مبارک کہتا ہوں۔

نامہ ہائے احباب

پیارے ارژنگ مدیر حسن عباسی صاحب

السلام علیکم۔ارژنگ ہمہ جہت نیرنگیوں کا شاہکار، اس برف باری کے موسم میں بہار آفریں ہوا۔طرح طرح کی تحریروں، تنوع آمیز لطافتوں سے سرشاری ہوئی۔ مکالمہ آرائی سے لطف پیدا ہوتا ہے۔انٹرویو کا یہ سدابہار پیرایہ ارژنگ ہی کا حصہ ہے۔مدیراعلیٰ عامر بن علی میاں چنوں مقیم جاپان میں پاکستانیت کا جھنڈا بلند کررہے ہیں۔اللہ انھیں اور توفیق دے۔اللہ، ال اہ کے ساتھ ال کے اضافے سے ہے۔ الا ہ مطلب مالک اللہ خاص مالک، خدا۔صاحب اس کا نعم البدل نہیں ہوسکتا۔ اللہ میں جو یکتائی و وحدانیت ہے وہ صاحب میں نہیں۔صاحب کا مادہ صحب ہے اس سے صحبت، صاحب (فاعل) مصحوب (مفعول) مصحب مصاحبت، مصاحبہ کا لفظی اہتمام ہے۔ان میں یکتائی نہیں۔ یہ سب متعلقات انسانی ہیں، آپ نے مجھے عزت دی۔غزل اور خط کی اشاعت سے دل شادآباد ہوا۔آپ سے دوستی پرانی ہے۔زبانی کلامی نہیں فقط لکھا پڑھی سے ہے۔آپ کے لیے دعا کرتا ہوں۔ ارژنگ کا ٹائٹل ہمیشہ کی طرح ''خوش اوقات'' ہے۔ اللہ نصب کرے صاحب جی۔

آصف ثاقب، بوئی ہزارہ

محترم حسن عباسی! آداب

اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔''ارژنگ'' موصول ہوگیا۔شکریہ!! خط تو لکھتی رہتی ہوں مگر اک عرصے سے میری کسی تحریر کو جگہ نہیں ملی۔کوئی بات نہیں یہ آپ کا استحقاق ہے۔ میں تو کوشش کرتی رہی ہوں، کچھ نہ کچھ بھیجتی رہتی ہوں۔ ارژنگ اپنے پورے طمطراق کے ساتھ چھپ رہا ہے۔سبھی تحریریں بہت عمدہ انٹرویوز کا سلسلہ بہت عمدہ ہے۔پچھلے شمارے میں نازبٹ صاحبہ کا انٹرویو اچھا لگا۔لیلیٰ صفدر بہت عمدہ کام کررہی ہے۔ایک غزل ''ارژنگ'' کے لیے بھیج رہی ہوں۔

سلامت رہیے

آسناتھ کنول، لاہور

محترم حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔اُمید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ڈاکٹر سلیم اختر میرے کرم فرما بزرگ تھے۔ان کے متعلق اپنی یادداشتوں کے حوالے سے ایک مضمون ارسال ہے۔ اُمید ہے کہ آپ اسے ''ارژنگ'' میں جگہ دیں گے۔''ارژنگ'' مجھے آج کل نہیں مل رہا۔ارسال کریں تو ممنون ہوں گا۔

مخلص

قاسم جلال،

محترم حسن عباسی! السلام علیکم۔

بعد از سلام دعا گو ہوں کہ پروردگار آپ کو اور آپ سے وابستہ تمام لوگوں کو تمام آفات سے محفوظ رکھے۔آمین ثم آمین

گزارش ہے کہ جنوری 2019ء کا ارژنگ ملا۔ دیکھتے ہی دل کو تسکین کا احساس ہوا۔ ٹائٹل دیکھتے ہی آپ کی محنت کو داد دینی پڑی۔ارژنگ کا ایک حرف اس بات کا ثبوت ہے کہ حسن عباسی ارژنگ کو کس جاں فشانی سے شائع کرتے ہیں۔ اللہ آپ کو اور آپ کی ٹیم کو شادوآباد رکھے۔آمین

عمران سلیم، لاہور

جناب! عامر بن علی مدیر اعلیٰ ''ارژنگ'' لاہور

اسلام علیکم۔سب سے پہلے میں شکرگزار ہوں کہ ماہنامہ ''ارژنگ'' مجھے باقاعدگی سے مل رہا ہے۔اس میں شائع ہونے والے تمام سلسلے بہت اچھے ہیں۔ خاص طور پر انٹرویوز کا سلسلہ کافی معلوماتی ہوتا ہے۔ سفرنامے کا سلسلہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ ملک میں مختلف شہروں میں لکھنے والے شعراء کا کلام میں بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔''ارژنگ'' روز بہ روز نکھرتا جارہا ہے۔ ہر بار اس کا ٹائٹل اپنے اندر منفرد خوبصورتی اور جاذبیت لیے ہوئے ہوتا ہے۔ میں آپ کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکرگزار ہوں کہ آپ مجھ ناچیز کا کلام بھی اپنے رسالے میں شائع کرتے ہیں۔ پہلی بار خط لکھ رہا ہوں اُمید ہے کہ حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

آصف نیاز، لاہور

میرے لئے شاعری ایک سنجیدہ ذریعۂ اظہار اور اپنے ذوق کی تسکین کا سبب ہے

نامور شاعر

محمد سلیم ساگر

سے حسن عباسی کی گفتگو

میری رائے میں غزل اور نظم دونوں ہی اپنا جداگانہ رنگ، اپنا الگ کینوس اور اپنا مختلف لطف رکھتی ہیں

اپنی ابتدائی زندگی کے متعلق کچھ بتائیے؟

میری پیدائش 19 اکتوبر 1973 کا مونکی ضلع گوجرانوالہ کی ہے۔ جہاں عمرِ عزیز کے ابتدائی چند سال گزارے۔

تعلیم اور ملازمت کے بارے میں کچھ بتائیے؟

والدین نے پرائمری تعلیم کیلئے مجھے آرمی برن ہال سکول و کالج ایبٹ آباد بھجوادیا جہاں سے میں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی اس کے بعد ایف سی کالج لاہور سے انٹرمیڈیٹ اور انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور سے مکینیکل انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ انجینئرنگ کے فوری بعد میں نے مقابلے کا امتحان (پنجاب سول سروس) پاس کیا اور بطور سیکشن آفیسر تعیناتی ہوئی۔ اس وقت میں بطور ڈپٹی سیکرٹری ٹو گورنمنٹ آف دی پنجاب اپنے فرائض منصبی سرانجام دے رہا ہوں۔

شاعری کی طرف رُجحان کیسے ہوا؟

شاعری سکول کے زمانے سے ہی میرے اندر رچی بسی تھی بہت سے اشعار ایک دفعہ سننے یا پڑھنے سے ہی یاد ہو جاتے تھے۔ درجہ ہفتم میں، میں نے پہلا شعر کہا جو درج ذیل ہے۔

ہم تیری محبت میں کس موڑ پہ آپہنچے
جینا بھی جہاں مشکل مرنا بھی جہاں مشکل

میر، غالب اور اقبال کے لاتعداد اشعار مجھے اسی دور میں یاد تھے۔

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)

ہم گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد کے ہونہار سکالر جناب **ساجد علی کو**

’’عامر بن علی کی شاعری کا فکری و فنی جائزہ‘‘

کے موضوع پر ایم۔ فل اردو کا تحقیقی مقالہ مکمل کرنے اور منظور ہونے پر

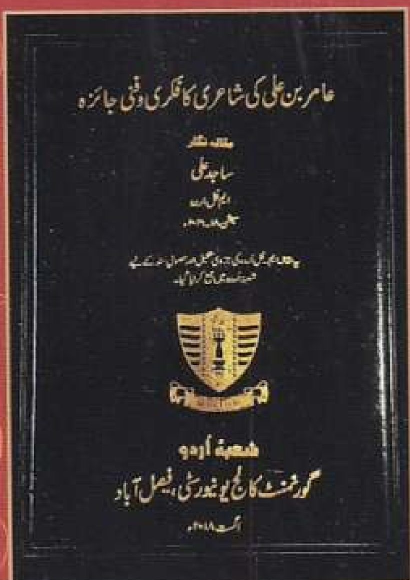

مقالہ نگار ساجد علی اپنا ایم فل اردو کا مقالہ عامر بن علی کو پیش کرتے ہوئے

مبارک باد پیش کرتے ہیں

نگران مقالہ : ڈاکٹر رابعہ سرفراز

ہم چیئرمین شعبہ اردو، سپروائزری کمیٹی اراکین اور چیئرمین ہائر ایجوکیشن کمیشن آف پاکستان (HEC) کے خصوصی شکر گزار ہیں جنہوں نے اس موضوع اور حصول سند کے لیے تحقیقی مقالے کی اجازت و منظوری عطا فرمائی۔

منجانب: **راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل** (رجسٹرڈ)

Design By: 0300-4529821
MUHAMMAD AHSUN Gull

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com